تعمیر کی طرف

مولانا وحید الدین خاں

تعمیر کی طرف

مستقبل کی تعمیر، لاقانونیت کا مسئلہ، تاریخ کا سبق
ترقی اور اتحاد، اصلاح کی طرف، نمونۂ انسانیت

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

Tameer ki Tarf

By Maulana Wahiduddin Khan

First Published 1988
Reprinted 2006

This book does not carry a copyright

Distributed by

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110 013
Tel. 462 5454, 462 6666
Fax 469 7333, 464 7980
e-mail: Skhan@vsnl.com
website: http://www.alrisala.org

تعمیر کی طرف

امریکہ کے سابق صدر رچرڈ نکسن (1913) نے اپنی کتاب ''فتح بغیر جنگ'' میں دوسرے ملکوں کے ساتھ ہندستان کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ ہندستان کے سیاسی نظام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> Those who believe India is not governed well should remember how miraculous it is that it is governed at all.
>
> Richard nixon, 1999 - Victory Without War, 1988

جولوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندستان میں اچھی حکومت قائم نہیں، انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ خود کیسا عجیب معجزہ ہے کہ وہاں حکومت قائم ہے (انڈین اکسپریس، 21/اپریل 1988)

ہندستان کے اجتماعی نظام کے بارے میں مسٹر نکسن کا یہ تبصرہ یقیناً بہت سخت ہے۔ مگر دانش مندی یہ ہے کہ اس پر شکایت کرنے کے بجائے اس کو ہم اپنے لیے ایک چیلنج سمجھیں۔ کہنے والے کے خلاف غصہ اتارنے کے بجائے ہم اپنی ساری توجہ ملک کی داخلی تعمیر میں لگا دیں، ہم ملک کو اتنا اونچا اٹھائیں کہ کسی ''نکسن'' کو ہمارے خلاف اس قسم کا ریمارک دینے کی ہمت نہ رہے۔ اس کی ایک مثال جاپان ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمہ پر جاپان دنیا کی نظر میں ایک حقیر ملک بن گیا تھا۔ مگر اس کے بعد 401 سالہ محنت کے ذریعہ جاپان نے اپنے آپ کو اتنا اوپر اٹھا لیا کہ اب کسی کو اس کے خلاف بولنے کی جرات نہیں ہوتی۔

ضرورت ہے کہ ہم ازسرِ نو اپنے معاملہ پر غور کریں۔ اور کسی تاخیر کے بغیر صحیح رخ پر اپنا سفر شروع کر دیں تاکہ ہمارا مستقبل ہمارے حال کے مقابلہ میں بہتر اور شاندار ہو سکے۔

نئی دہلی کے انگریزی اخبار انڈین اکسپریس (7 فروری، 14 فروری 1987) میں ہندستان کے سینیر جرنلسٹ ایس ملگاوکر (S.Mulgaokar) کا ایک آرٹیکل دو قسطوں میں چھپا تھا جس کا عنوان یہ تھا:

Can systemic changes provide the entire answer

(کیا ڈھانچہ میں تبدیلی مکمل جواب ہے) مضمون نگار نے اس میں کہا تھا کہ ہماری آزادی پر چالیس سال بیت چکے ہیں۔ ہم نے کئی اعتبار سے ترقی بھی کی ہے۔ مگر ہمارے مسائل ابھی زیادہ ہیں۔ اور مجموعی طور پر ہمارے مسائل ہماری ترقی سے بڑھے ہوئے ہیں:

Our problems are many and serious, and on balance, appear to outweigh the progress.

مسٹر ملگاوکر نے ان لوگوں کی بات کو نہیں مانا تھا جو حالات کو ٹھیک کرنے کے لیے ڈھانچہ میں تبدیلی کی بات کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ڈھانچہ کو آخر کار آدمی ہی تو چلاتے ہیں۔ جب آدمی اچھے نہ ہوں تو ڈھانچہ کیسے اچھا کام کرے گا:

In the final analysis, a system is only as good as those who operate it.

مسٹر ملگاوکر کی اس بات سے مجھے اتفاق ہے۔ اس کو بڑھاتے ہوئے میں کہوں گا کہ مہاتما گاندھی نے ہمارے ملک کو سیاسی بنیاد (Political base) دی۔ اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھ میں اقتدار آیا اور انہوں نے اس ملک کو صنعتی بنیاد (Industrial base) دی۔ اب ضرورت ہے کہ تیسرا ضروری کام کیا جائے۔ اور وہ ہے اس ملک کو اخلاقی بنیاد (Moral base) دینا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تیسری چیز (اخلاقیات) قومی زندگی میں فیصلہ کن عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا تقریباً سبھی لوگوں نے اعتراف کیا ہے۔

ملک کو اخلاقی بنیاد دینے کا کام کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ مشکل ترین کام ہے اور اس کے لیے نہایت صبر آزما جدوجہد کی ضرورت ہے۔ لمبی خاموش جدوجہد کے ذریعہ ہمیں یہ کرنا ہے کہ لوگوں کے اندر اخلاقی بیداری (Moral awareness) پیدا کریں۔ قومی تعمیر کے سلسلہ میں یہ بہت بنیادی بات ہے۔ اس اصلاحی کام میں ہمارا سفر ذہنی تعمیر (Mind building) سے شروع ہونا چاہیے نہ کہ سیاسی ڈھانچہ کے خلاف مظاہرہ اور ایجی ٹیشن سے، اس مہم میں ہمارا نشانہ انسان کو بدلنا ہے نہ کہ حکمرانوں کو بدلنا۔

اخلاقی بیداری کا لفظ یہاں میں کسی محدود معنی میں نہیں بول رہا ہوں، بلکہ وسیع معنی میں

بول رہا ہوں۔ اس سے میری مراد خاص طور پر وہ چیز پیدا کرنے سے ہے جس کو دوسرے لفظوں میں تعمیری سوچ (Constructive thinking) کہا جا سکتا ہے۔ یعنی ردعمل کا طریقہ چھوڑ کر مثبت طریقہ کا پابند ہونا۔ مسائل کو لڑے بغیر حل کرنے کی کوشش کرنا۔ دوسروں سے ٹکراؤ کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی زندگی کا سفر طے کرنا۔ ممکن چیز (Possible) سے اپنا عمل شروع کرنا نہ کہ اس چیز سے جو ناممکن (Impossible) ہے۔ یہی اصلاح کا حقیقی طریقہ ہے۔ اس کے سوا جو طریقے ہیں، وہ سب کھونے کے طریقے ہیں، وہ پانے کے طریقے نہیں۔

جاگ یا اویرنس پیدا کرنے کا کام اسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب کہ وہ تعمیری انداز میں ہو۔ یعنی اس کا رخ اپنی طرف ہو نہ کہ دوسروں کی طرف۔ دوسروں سے مانگ کرنے کے بجائے اپنے آپ کو دیکھا جائے۔ اپنے حقوق سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس ابھارا جائے۔ لوگوں کے اندر جذباتی اندازِ فکر (Emotional approach) ختم کیا جائے اور ان کے اندر عقلی اندازِ فکر (Rational appraoch) پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ ذہن بنایا جائے کہ لوگ معاملہ کو دوسرے کے اوپر نہ ڈالیں بلکہ اس کی ذمہ داری خود قبول کریں۔ جہاں معاملہ ایک سے زیادہ آدمیوں کا ہو وہاں ذمہ داری خود قبول کرنے سے مسئلہ حل ہوتا ہے، دوسروں کے اوپر ڈالنے سے کبھی مسئلہ ختم نہیں ہو سکتا۔

اویرنس پیدا کرنے کا یہ کام مجاریٹی اور مائناریٹی کمیونٹی دونوں کے درمیان کرنا ہے۔ دونوں کے اندر یہ سوچ ابھارنا ہے کہ وہ دوسروں کو الزام دینے کا طریقہ چھوڑیں اور اپنے آپ میں جھانک کر دیکھنے کا مزاج پیدا کریں۔ وہ ماضی کی باتوں کو بھلائیں اور مستقبل کے لحاظ سے اپنی منصوبہ بندی کریں۔

اسی کے ساتھ ایک اور چیز ہے جو لیڈرشپ کی سطح پر مطلوب ہے۔ 1947 سے پہلے ہمارے لیڈروں نے ''انگریز ہٹاؤ'' کا نعرہ دیا تھا۔ اس کے بعد مسز اندرا گاندھی نے ''غریبی ہٹاؤ'' کا نعرہ دیا۔ مسٹر راجیو گاندھی نے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے 79 ویں اجلاس (اپریل 1988) میں ''بیکاری ہٹاؤ'' کا نعرہ دیا ہے۔ مگر محض اس قسم کے نعروں سے ملک کا مسئلہ نہ اب

تک حل ہوا ہے اور نہ آئندہ حل ہونے والا ہے۔ اصلی نعرہ جس سے مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ وہ ہے۔۔۔۔۔''اپنے آپ کو ہٹاؤ''

حقیقت یہ ہے کہ اس ملک کو سیاسی اعتبار سے ایک ڈی گال کی ضرورت ہے۔ ہمارے لیڈر اگر ڈیگال بننے کا حوصلہ کریں تو سارے مسائل چند برسوں میں حل ہو سکتے ہیں۔ موجودہ نعروں کی صورت میں وہ سو برس میں بھی حل ہونے والے نہیں۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قوم کو زندہ کرنے کے لیے فرد کو اپنے آپ کو ہلاک کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں فرانس کے چارلس ڈیگال (1970۔1890) نے اس کی ایک مثال پیش کی ہے۔ اور ہندستان کو آج اپنے حالات کے اعتبار سے اسی قسم کے ایک ڈیگال کی ضرورت ہے۔

ڈیگال 1958 میں فرانس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس وقت افریقہ میں فرانس کے تقریباً ایک درجن مقبوضات تھے جن میں آزادی کی تحریک چل رہی تھی۔ خاص طور پر الجیریا میں یہ تحریک بہت شدت اختیار کر چکی تھی۔ فرانس نے اسکو کچلنے کے لیے تقریباً 25 لاکھ لوگوں کو سزائیں دیں یا قتل کر دیا۔ اس کے باوجو الجیریا میں آزادی کی تحریک دبتی ہوئی نظر نہیں آتی تھی۔ یہ صورت حال چارلس ڈیگال کے لیے سخت تشویش ناک بن گئی۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984) کے الفاظ میں، الجیریا کی جنگ کے مسائل ان کے لیے اس میں روک بن گیے کہ وہ مستقبل کی مثبت پالیسیوں (Positive policies) کے بارے میں خاکہ بنانے سے زیادہ کچھ کر سکیں (جلد 7، صفحہ 964)

فرانس اپنے افریقی مقبوضات کو فرانس کا صوبہ (Province) کہتا تھا۔ وہ ان کی زبان اور کلچر کو اس حد تک بدل دینا چاہتا تھا کہ وہاں کے باشندے اپنے آپ کو فرانسیسی کہنے اور سمجھنے لگیں، مگر یہ منصوبہ فرانس کے لیے بہت مہنگا پڑا۔ عملاً یہ ممالک فرانس کا صوبہ نہ بن سکے اور اس غیر حقیقت پسندانہ کوشش نے خود فرانس کو ایک کمزور ملک بنا دیا۔ فرانس کی تمام بہترین طاقت مقبوضہ ممالک میں آزادی کی تحریکوں کو دبانے اور کچلنے میں استعمال ہونے لگی اور فرانس نے یورپ کی ایک عظیم طاقت (Great power) ہونے کی حیثیت کھودی۔

سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ افریقہ پر قبضہ کرنے کی کوشش میں فرانس ایٹمی دوڑ میں پیچھے ہو گیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ چارلس ڈیگال نے محسوس کیا کہ نوآبادیاتی جنگ لڑنے کی کوشش فرانس کے لیے اس میں مانع ہوگئی ہے کہ وہ بڑے پیمانی پر ایٹمی تحقیق کرے۔ چنانچہ ڈیگال سے الجیریا کو آزاد کردیا اوراس کے بعد مضبوط ایٹمی طاقت کو وجود میں لانے کی کوشش شروع کردی جو فرانس کی عظیم حیثیت کے لیے نئی بنیاد بن سکے۔ (جلد 4، صفحہ 905)

ڈیگال نے معاملہ کو قومی ساکھ یا ذاتی قیادت سے الگ ہو کر دیکھا۔ ٹھنڈے دل سے سوچنے کے بعد وہ اس رائے پر پہنچے کہ اس مسئلہ کا حقیقت پسندانہ حل صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ افریقی مقبوضات کو آزاد کر دیا جائے۔ تاہم فرانس کے لیے یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ یہ فرانس کے قومی عزت ووقار (National prestige) کا مسئلہ تھا اور قومی وقار ایسی چیز ہے کہ قومیں لڑ کر تباہ ہو جاتی ہیں مگر وہ اپنے وقار کو کھونا برداشت نہیں کرتیں۔ یہ یقینی تھا کہ جو شخص اس معاملہ میں قومی وقار کے خلاف فیصلہ کرے گا وہ فرانس میں اپنی مقبولیت کو یکسر ختم کر دے گا۔ تاہم ڈیگال نے یہ خطرہ مول لیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں: ڈیگال نے الجیریا کے مسئلہ کو اس وقت حل کر دیا جب کہ ان کے سوا کوئی دوسرا شخص اس کو حل نہیں کرسکتا تھا (جلد 7، صفحہ 965)

جنرل ڈیگال نے اس کے بعد الجیریا کے لیڈروں کو گفت وشنید کی دعوت دی۔ اس گفت وشنید کا فیصلہ عین منصوبہ کے تحت الجیریا کے حق میں ہوا۔ یعنی حکومت فرانس اس پر راضی ہوگئی کہ الجیریا میں ریفرنڈم کرایا جائے اور لوگوں سے پوچھا جائے کہ وہ فرانس کی ماتحتی پسند کرتے ہیں یا آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ ریفرنڈم ہوا۔ پیشگی اندازے کے مطابق الجیریا کے باشندوں نے آزاد الجیریا کے حق میں اپنی رائیں دیں اور اس کا احترام کرتے ہوئے حکومت فرانس نے جولائی 1962 میں الجیریا کی آزادی کا اعلان کر دیا۔

اس کے نتیجہ میں چارلس ڈیگال پر سخت تنقیدیں ہوئیں۔ ان کے اوپر قاتلانہ حملے کیے گیے۔ اس کے بعد عوام کے دباو کے تحت ڈیگال نے فرانس میں ایک ریفرنڈم کرایا جس میں

ڈیگال کوشکست ہوئی۔ بالآخر انھوں نے 28 اپریل 1979 کو صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ 9 نومبر 1970 کو ان پر قلب کا دورہ پڑا اور ان کا انتقال ہوگیا۔ ڈیگال ایک معمولی قبرستان میں اس طرح دفن کر دیئے گیے کہ ان کے جنازے میں ان کے رشتہ داروں اور چند دوستوں کے سوا کوئی اور شریک نہ تھا۔ ڈیگال خود مر گیے۔ مگر انھوں نے مر کر اپنی قوم کو دوبارہ زندگی دے دی۔

ڈیگال کے اس واقعہ سے یورپ میں ایک اصطلاح بنائی گئی ہے جس کو گالزم (Gaulism) کہا جاتا ہے۔ گالزم دراصل اپنی قیادت کی قیمت پر قوم کو بچانا ہے۔ برٹانیکا (1984) کے الفاظ میں ڈیگال تنہا شخص تھے جس میں یہ حوصلہ تھا کہ وہ ایسے نازک فیصلے لے سکیں جن سے سخت قسم کے سیاسی اور شخصی خطرات (Political and personal risks) وابستہ ہوتے ہیں (7/965)

یہی گالزم قومی زندگی کا راز ہے۔ ہندستان کو آج ایسے باحوصلہ سیاست داں کی ضرورت ہے جو ملکی حالات کے اعتبار سے ''گالزم'' کے اصول پر عمل کر سکے۔ جو اپنے ذاتی فائدہ پر قوم کے فائدہ کو مقدم کرے۔ جو اپنے مستقبل کو ہلاک کر کے قوم کے مستقبل کی تعمیر کر سکے، ہماری دعا ہے کہ ہندستان کو اسی قسم کا ایک ڈیگال مل جائے۔ موجودہ بھنور سے نکلنے کا اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔

ہمارے موجودہ لیڈروں کی اصل خرابی یہ ہے کہ وہ ہر معاملہ کو ''ووٹ'' کے نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں نہ کہ ملکی مفاد کے نقطہ نظر سے۔ حکمرانوں کی ایک نسل میں اگر یہ مزاج آجائے کہ وہ ذات کے بجائے ملک کو مقدم کر سکیں تو اس کے بعد فوراً ملکی تعمیر کا سفر شروع ہوجائے گا۔ اور جو سفر ایک بار شروع ہوجائے وہ بہر حال اپنی منزل پر پہنچ کر رہتا ہے۔

لاقانونیت کا مسئلہ

مارچ 1988 کی 12 تاریخ ہے۔ اور صبح 8 بجے کا وقت۔ میرے دفتر (نئی دہلی) سے متصل پارک میں رنگ برنگ کے پھول نہایت حسین منظر پیش کر رہے ہیں۔ اتنے میں کالونی کی ایک خوش پوش عورت پارک میں داخل ہوتی ہے۔ وہ پھول توڑنا چاہتی ہے۔ مالی اس کو منع کرتا ہے۔ مگر وہ باز نہیں آتی۔ وہ اپنے کچھ پسندیدہ پھولوں کو توڑ کر ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ اور باہر سڑک پر آ کر فاتحانہ انداز میں کہتی ہے: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے باپ کا پارک ہے۔ ہم پھول توڑیں گے، دیکھیں کون ہم کو روکتا ہے پھول توڑنے سے۔

یہ چھوٹا سا واقعہ اس ہندستان کی تصویر پیش کرتا ہے جس کو آزاد ہندستان کہا جاتا ہے۔ آزاد ہندستان دراصل لاقانونی ہندستان کا دوسرا نام ہے۔ آج ملک کے جس شعبہ کو دیکھئے۔ ہر جگہ لاقانونیت ہے۔ سرکاری دفتروں سے لے کر سڑک کی ٹریفک تک تعلیمی اداروں سے لے کر سیاسی پارٹیوں تک، ملک کا کوئی بھی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں قانون کا احترام پایا جاتا ہو۔ اپنے ذاتی مفاد کے سوا اور کوئی چیز نہیں جس کو لوگ جانتے ہوں۔ اپنی ذاتی انا کے سوا اور کوئی چیز نہیں جس کا لحاظ کرنے کی ضرورت انھیں محسوس ہوتی ہو۔ قانون کی پابندی کرنے والے شہری (Law abiding citizen) نام کی کوئی چیز جدید ہندستان میں نہیں پائی جاتی۔

اس تاثر کے تحت آج جب میں نے دہلی کے اخبارات پڑھے تو مجھے محسوس ہوا کہ اس لاقانونیت کا ڈانڈا دراصل ڈانڈی مارچ سے ملتا ہے۔ آج (12 مارچ 1988) کے اخبارات نے ڈانڈی مارچ کے واقعہ کی تفصیلات نمایاں طور پر شائع کی ہیں۔ ڈانڈی مارچ کیا تھا۔ وہ گویا قانون شکنی کی طرف اکابر قوم کا مارچ تھا۔ یہ قانون شکنی کو گلوریفائی کرنے کے ہم معنی تھا۔ اور جب کسی قوم میں ایک بار قانون شکنی کی روایت قائم کر دی جائے تو پھر وہ کسی حد پر نہیں رکتی۔

ڈانڈی مارچ ہندستان کی تاریخ آزادی کا مشہور واقعہ ہے۔ یہیں سے مہاتما گاندھی کی سول نافرمانی (Civil Discobedience) کا آغاز ہوتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد پورے

ملک میں برٹش راج کے خلاف عوامی تحریک اٹھ کھڑی ہوتی ۔ لوگ بے خوف ہو کر انگریز حکمرانوں کو ہر جگہ چیلنج کرنے لگے ۔ انگریزی قانون کو توڑنا قومی ہیرو بننے کے ہم معنی ہو گیا۔ ایک سال کے اندر 60 ہزار آدمی خوشی خوشی جیل چلے گئے وغیرہ۔

مہاتما گاندھی 12 مارچ 1930 کو سابرمتی آشرم سے پیدل روانہ ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ 79 آدمی تھے۔ انھوں نے 241 میل کا سفر 24 دن میں طے کیا اور 15/اپریل 1930 کو ساحل سمندر پر پہنچے۔ انھوں نے وہاں ٹیکس کی ادائیگی کے بغیر نمک حاصل کر کے قانون شکنی کے عمل کا آغاز کیا۔ اس پورے راستہ میں گاندھی جی کو اطراف کی بستیوں سے اتنا زبردست استقبال ملا جو کسی بادشاہ کے لیے بھی قابل رشک ہوسکتا تھا۔ مہاتما گاندھی ایک ہیرو کی مانند سابرمتی سے ڈانڈی پہنچے۔ وہاں انہوں نے 5/اپریل 1930 کو اپنے قلم سے لکھا کہ میں طاقت کے خلاف حق کی اس جنگ کے لیے عالمی ہمدردی چاہتا ہوں:

I want world sympathy in this battle of Right against Might.

12 مارچ 1988 کے دہلی کے اخبارات میں ڈانڈی مارچ کے بارے میں اس قسم کی مختلف تفصیلات شائع ہوئی ہیں۔ ان کو پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ 60 برس پہلے مہاتما گاندھی اور ان کے ساتھی یہ سمجھتے تھے کہ ملک کا اصل مسئلہ ملک سے برٹش راج کو ختم کرنا ہے۔ مگر اس واقعہ کے 60 برس بعد دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ اصل مسئلہ ''برٹش راج'' کو ختم کرنا نہیں تھا بلکہ ''نفسانی راج'' کو ختم کرنا تھا۔ برٹش راج ختم ہو گیا مگر نفسانی راج مزید شدت کے ساتھ باقی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پورا ملک پہلے سے بھی زیادہ بے امنی اور بدعنوانی کا نمونہ بنا ہوا ہے۔ موجودہ ہندستان میں کسی شریف اور با اصول آدمی کے لیے کوئی جگہ نہیں ۔ اسکے لیے موجودہ ہندستان میں زندہ رہنا ایسا ہی ہے جیسا کانٹوں کے فرش پر زندہ رہنا۔

مہاتما گاندھی کے ساتھ ڈانڈی مارچ (1930) کے قافلہ میں جو لوگ شریک تھے، ان میں سے کچھ افراد بوقت تحریر زندہ ہیں۔ ان میں سے ایک مسٹر کپل پرسادد یو ہیں جن کی عمر اب 88 سال ہو چکی ہے۔ گاندھی نگر میں انھوں نے ہندستان ٹائمس (12 مارچ 1988) کے نامہ نگار مسٹر اشوک

ویاس اس سے ماضی کی یادوں کو بتاتے ہوئے کہا کہ ہمارا قافلہ جب چلتے ہوئے سورت پہنچا تو وہاں کے لوگوں نے ڈانڈی مارچ والوں کے لیے ایک پر تکلف لنچ کا انتظام کیا۔ لوگ شوق سے اس دعوت میں شریک ہوئے اور خوب سیر ہو کر کھایا پیا۔ جب گاندھی جی کو اس کا علم ہوا تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ اس سفر کے دوران ہر شام کو وہ مجلس کرتے تھے۔ اس روز شام کی مجلس میں انھوں نے کہا:

I think I have committed a Himalayan blunder in selecting the Satyagrahis for this kooch. When majority of the countrymen could not get a bajra roti and chatni or onion how could you think of taking such lavish lunch.

میرا خیال ہے کہ میں نے ستیہ گریوں کو اس کوچ کے لیے منتخب کر کے ہمالیہ پہاڑ کے برابر غلطی کی ہے۔ ملک کے باشندوں کی اکثریت کو کھانے کے لیے باجرہ کی ایک روٹی اور چٹنی یا پیاز بھی نہیں ملتی۔ ایسی حالت میں آپ لوگوں نے کیوں کر یہ سوچا کہ آپ ایسا پر تکلف کھانا کھائیں۔

مہاتما گاندھی اگر آج زندہ ہوتے تو یقیناً وہ محسوس کرتے کہ سورت کی پر تکلف دعوت کو قبول کرنے سے زیادہ بڑی غلطی خود ڈانڈی مارچ کا فیصلہ تھا جو قانون شکنی یا سول نافرمانی (Civil Disobedience) کے طور پر زیر عمل لایا گیا تھا۔ جدید ہندستان میں سب سے پہلی ہمالیائی غلطی یہ تھی کہ انگریزوں کے خلاف ''نافرمانی'' کے طریقہ پر عمل کر کے قانون شکنی کی روایت قائم کی گئی۔ کسی ملک کے اکابر جب ایک بار قانون کے احترام کی روایت کو توڑ دیں اور قانون شکنی کو مقدس قومی عمل کی حیثیت سے رائج کریں تو اس کے بعد ملک کو لاقانونیت (Lawlessness) کی طرف جانے سے روکا نہیں جا سکتا۔ اور آزادی کے بعد کا ہندستان، جہاں لاقانونیت ہی کا نام قانون ہے۔ بلاشبہ اسی غلطی کا نتیجہ ہے جس کا آغاز 60 سال پہلے تمام اکابر قوم کی متفقہ منظوری سے کیا گیا تھا۔

مہاتما گاندھی نے 1947 سے پہلے برٹش راج کو ختم کرنے کے لیے تحریک چلائی تو سارا ہندستان ان کے ساتھ ہو گیا۔ وہ ملک کے ہیرو بن گئے، مگر اسی مہاتما گاندھی نے 1947 کے بعد نفسانی راج کو ختم کرنے کی مہم شروع کی تو انھیں آزاد ہندستان کے عین قلب میں گولی مار کر ختم کر دیا گیا۔۔۔ احتساب غیر کے عنوان پر لیڈر بننا کتنا آسان ہے اور احتساب خویش کے عنوان پر لیڈر بننا کتنا مشکل۔

تعمیرِ قوم کی ضرورت

30 جنوری 1948 کو مہاتما گاندھی کا قتل ہوا تو اس وقت میں اعظم گڑھ میں تھا۔ اگلے دن شہریوں کی طرف سے ایک جلسہ ہوا جس میں مختلف لوگوں نے تقریریں کیں۔ مقامی ایس کے پی کالج کے ہندو پرنسپل نے اس موقع پر جو تقریر کی تھی وہ اب تک مجھے یاد ہے۔ انھوں نے کہا کہ مہاتما گاندھی کے قتل کے واقعہ پر مختلف اخبارات نے اپنے اپنے انداز میں سرخی لگائی ہے۔ مگر مجھے امرت بازار پتریکا کی سرخی سب سے زیادہ پسند آئی جو اس طرح تھی:

Gandhi sacrificed by fanaticism

(گاندھی جنونیوں کے ہاتھ ھلاک) اس میں شک نہیں کہ مہاتما گاندھی کے حادثہ کے بارے میں یہ صحیح ترین سرخی تھی۔ آزادی کے بعد ہندستان میں دو رجحانات کا مقابلہ تھا۔۔۔۔ گاندھی ازم اور فنیٹسزم۔ اس مقابلہ میں فنیٹسزم کو کامیابی ہوئی، گاندھی ازم ناکام ہو کر رہ گیا۔

ملک کی تقسیم بلاشبہہ غلط تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ غلط بات یہ تھی کہ تقسیم کے بعد لوگ اس کے ردعمل سے اپنے آپ کو بچا نہ سکے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ آزادی کے بعد ہندوؤں کی ایک جماعت مہاتما گاندھی کی سخت مخالف ہو گئی۔ اس نے مہاتما گاندھی کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ اولاً مدن لال نے مہاتما گاندھی پر دستی بم پھینکا مگر وہ نشانہ پر نہیں پہنچ سکا۔ اس کے بعد اس کے ساتھی ناتھورام گوڈسے نے پستول کی گولی سے مہاتما گاندھی کا خاتمہ کر دیا۔

اس کے بعد 9 آدمیوں پر مقدمہ چلایا گیا جو 6 ماہ سے زیادہ مدت تک جاری رہا۔ اس موقع پر بیان دیتے ہوئے مدن لال نے جو کچھ کہا تھا ان میں سے ایک یہ تھا کہ اس کو اس بات کا غصہ تھا کہ مہاتما گاندھی کے اصرار پر ہندستانی حکومت نے پاکستان کو اس کے حصہ کا 55 کروڑ روپیہ دے دیا۔ اس واقعہ نے گوڈسے کو مشتعل کر دیا:

Madan Lal said he was angered by the Indian Union's payment of 550,000,000 rupees to Pakistan. This exasperated Godse.

louis Fischer, The Life of Mahatma Gandlu

Harper & Row Publishers, 1983, New York, p.504

آزادی کے بعد صرف ساڑھے چار مہینہ کے اندر پیش ہونے والا یہ واقعہ ملک کے لیے

ایک چیلنج تھا۔۔۔۔وہ مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے اصول پر چلے یا قوم پرست جنونیوں کے آگے جھک جائے۔ ملک کی قیادت نے ابتداءً یہ فیصلہ کیا کہ اس کو مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے اصولی راستہ پر چلنا ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق ملک کا دستور بنایا گیا۔ اور 26 جنوری 1956 کو اس کے باقاعدہ نفاذ کا اعلان کر دیا گیا۔

اب بظاہر ملک کے مستقبل کی تعمیر دستور ہند کی رہنمائی میں ہونی چاہئے تھی۔ مگر یہاں ایک رکاوٹ پیش آ گئی۔ دستور ساز اسمبلی کے ارکان نے پارلیمنٹ ہاوس کی چھت کے نیچے بیٹھ کر جو کچھ کاغذ پر لکھا تھا وہ لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر نہ لکھا جا سکا۔ کاغذی دفعات کے مطابق ملک کا مذہب سیکولرزم تھا، مگر عوامی رجحان کے مطابق ملک کا مذہب بدستور فنیٹسزم (مجنونانہ قوم پرستی) بنا رہا۔ اس تضاد کا اظہار پچھلی تقریباً نصف صدی کے دوران مختلف صورتوں میں ہوتا رہا ہے۔

یہ صورت حال ملک کے لیڈروں کے لیے سخت آزمائش تھی۔ کاغذ کے اوپر خوبصورت دفعات لکھنے کے لیے بازار کی سیاہی کافی ہے۔ مگر زندگی میں ان دفعات کے عملی نفاذ کے لیے اس قربانی کی ضرورت تھی جس کو ڈیگال کے نام پر گال ازم کہا جاتا ہے۔ ہمارے لیڈروں نے پہلا کام تو کیا، مگر وہ دوسرا کام نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ دستور ہند کے الفاظ ملک کی حقیقی زندگی میں واقعہ نہ بن سکے۔

ملک میں جو دستور بنایا گیا تھا وہ حقیقۃً ارکان اسمبلی کی سطح پر بنایا گیا تھا وہ وسیع تر سطح پر عوامی رجحانات کا نمائندہ نہ تھا۔ اس لئے بہت جلد دونوں کے درمیان ٹکراو پیش آ گیا۔ دستور کے الفاظ شہریوں کے درمیان مساوات کا اعلان کر رہے تھے۔ مگر ملکی عوام تعصب اور امتیاز کے راستہ پر چلتے رہے۔ دستور کے الفاظ ہر ایک کے لیے یکساں انصاف کی ضمانت دے رہے تھے مگر عوامی رجحان کا تقاضا تھا کہ اپنوں کے ساتھ ایک سلوک کیا جائے اور غیروں کے ساتھ دوسرا سلوک۔

یہاں ملکی حکمرانوں کو دستور کا ساتھ دینا تھا نہ کہ عوامی خواہشات کا۔ مگر انھوں نے دیکھا کہ اگر وہ دستور ہند کے بتائے ہوئے راستہ پر چلیں تو وہ اپنے حق میں عوام کی سیاسی حمایت کھو دیں گے، اگلے الکشن کے موقع پر انھیں عوام کا ووٹ حاصل نہ ہو سکے گا۔ وہ عوامی خواہشات کے آگے جھک گئے اور دستور کو پس پشت ڈال دیا۔ اگر چہ یہ دستور وہی تھا جس کے ساتھ وفاداری کا حلف لے کر وہ حکومت کے ایوان میں داخل ہوئے تھے۔

تاریخ کا سبق

جرمن ڈکٹیٹر اڈولف ہٹلر (1945-1889) ذاتی حفاظت کے لیے اپنے پاس ایک خاص پستول رکھتا تھا۔ اس پستول پر سونے کا کام تھا۔ اور اس کا دستہ ہاتھی دانت کا بنا ہوا تھا۔ یہ پستول دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکی فوجیوں کو میونخ میں ہٹلر کے مکان میں ملا۔ اس وقت سے یہ پستول محفوظ رکھا ہوا تھا۔ تازہ اطلاع کے مطابق اس کو نیلام کر دیا گیا ہے۔ ایک شخص نے اس کو 1,14,000 ڈالر میں خرید لیا۔ یہ پستول اور بندوق کی پوری تاریخ میں سب سے زیادہ قیمت ہے جو کسی ایک دستی ہتھیار کو ادا کی گئی۔ (ٹیلیگراف 22 نومبر 1987)

دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہٹلر کو سابق متحدہ جرمنی میں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ حتی کہ وہ ملک کا ڈکٹیٹر بن گیا۔ تاہم اس ''قائداعظم'' نے جرمنی کو ''قوم اصغر'' بنانے کے سوا اور کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ ہٹلر نے جو حالات پیدا کئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کا وسیع ملک تقسیم ہو کر کئی حصوں میں بٹ گیا، اور اس پر چار بیرونی طاقتوں (روس، برطانیہ، امریکہ، فرانس) کا غلبہ قائم ہو گیا۔ خود ہٹلر کا آخری انجام یہ ہوا کہ جس پستول کو وہ اپنی ذاتی حفاظت کے لیے ہر وقت اپنے پاس رکھتا تھا، دوسری جنگ عظیم میں شکست کے بعد اس نے 30 اپریل 1945 کو اسی پستول سے اپنے آپ کو مار خودکشی کر لی ـــــــ ہٹلر نے اپنی قوم کو بھی ہلاک کیا اور بالآخر خود اپنے آپ کو بھی۔

ہٹلر کا عروج کس طرح ہوا

جدید اقتصادی تاریخ کے بارے میں آپ کوئی کتاب پڑھیں تو آپ کو اس میں ایک اصطلاح عظیم بحران (Great Depression) کی ملے گی۔ اس سے مراد وہ غیر معمولی کساد بازاری ہے جو یورپ اور امریکہ میں 1929 میں شروع ہوئی۔ اور 1939 تک جاری رہی۔ اس زمانہ میں مخصوص اسباب کے تحت صنعتی پیداوار گوداموں میں ڈھیر ہو گئی اور بازار میں ان کے خریدار بہت کم ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کارخانے بند ہو گئے۔ اقتصادی سرگرمیاں ٹھپ ہو گئیں۔

تقریباً 25 فیصد صنعتی کارکن بالکل بے روزگار ہو گئے۔ جرمنی میں بے روزگار آدمیوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ مغربی دنیا کی نصف تجارت برباد ہو کر رہ گئی۔

یہ بحران ابتدائی طور پر اگرچہ اقتصادی تھا، مگر اس کے نہایت اہم سیاسی نتائج برآمد ہوئے۔ انتہا پسند عناصر زیادہ طاقت ور ہو گئے اور اعتدال پسند لوگوں کی ساکھ بہت گھٹ گئی:

The Depression had important consequences in the political sphere. strengthening extremist forces and lowering the prestige of Liberal democracy (IV/6960)

کسی سماج میں بظاہر سب سے زیادہ طاقت ور ادارہ حکومت کا ہوتا ہے، اس لئے عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی بڑی مصیبت پڑتی ہے تو لوگ اس کو حکمرانوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں عمومی طور پر وقت کے حکمرانوں کے خلاف فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اس نفسیات کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص مصائب کا ذمہ دار حکومت کو قرار دے اور اس کے خلاف پر جوش تقریریں کرے، وہ لوگوں کو اپنا سچا ہمدرد دکھائی دیتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص مجموعی حالات کی روشنی میں مسائل کا تجزیہ کرے وہ لوگوں کی نظر میں ''ظالم حکومت'' کا ایجنٹ بن جاتا ہے۔ ایسے شخص کے متعلق لوگوں کا گمان یہ ہو جاتا ہے کہ وہ عوام کو عمل کے اصل نشانہ سے ہٹا دینا چاہتا ہے۔

زمانہ بحران (39-1929) میں جرمنی کے یہی حالات تھے جس کو ہٹلر نے استعمال کیا۔ اس نے تمام مصیبتوں کا ذمہ دار حکومت وقت کو قرار دے کر اس کے خلاف آتشیں تقریریں شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ جرمنی کا سب سے مقبول لیڈر بن گیا۔ ایک مورخ کے الفاظ میں 1929 کے بعد پیدا ہونے والے اقتصادی بحران سے ہٹلر کو عوامی تائید ملی۔ اور اس کی پارٹی جرمنی کی سب سے بڑی پارٹی بن گئی:

Economic depression after 1929 brought mass support, making (1932) Nazis largest party in Reionstag. Hitler was appointed Chancellor (Jan. 1933). established dictatorship in Germany.

دوسری مثال

ایک طرف ہٹلر کی یہ تاریخ ہے۔ دوسری طرف اسی یوروپ میں برطانیہ کی ایک تاریخ ہے۔ برطانیہ میں اس کے بالکل برعکس انداز میں ایک ''پارٹی'' بنی۔ جو عام طور پر فیبین سوسائٹی کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس کا طریقہ فکر اور اس کا انداز اس سے مختلف تھا جو ہٹلر کا اور اس کی نیشنل سوشلسٹ (نازی) پارٹی کا تھا۔ فیبین سوسائٹی برطانیہ میں کبھی عوامی مقبولیت حاصل نہ کرسکی مگر اس نے برطانیہ کے لیے جو کام کیا وہ نازی پارٹی کے مقابلہ میں ہزاروں گنا زیادہ اہم تھا۔

فیبین سوسائٹی لندن میں 1883 میں قائم ہوئی۔ اس کا مقصد سرمایہ دارانہ نظام کی برائیوں کو دور کرنا تھا۔ اس سوسائٹی میں ابتداءً جو لوگ شریک ہوئے ان میں سے ایک جارج برنارڈ شاہ (1856-1950) تھا۔ برناڈ شا اپنے اندر عوام پسند تقریر کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ چنانچہ اس کی تقریروں نے اس تحریک کے گرد ایک بھیڑ جمع کردی۔ نوجوان برنارڈ شا نے اس کے بعد عوامی مظاہرہ کا منصوبہ بنایا اور اپنے ساتھیوں کو لے کر ایک جلوس نکالا۔ اس جلوس میں زیادہ تر درمیانی طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ یہ لوگ جب مارچ کرتے ہوئے لندن کے ان علاقوں میں پہنچے جہاں بڑے بڑے دولت مند رہتے تھے تو ان کے کچھ افراد تشدد پر اتر آئے اور توڑ پھوڑ کرنے لگے۔

اس پہلے تجربہ کے بعد ہی فیبین سوسائٹی کے رہنما جلوس اور مظاہرہ کے سخت مخالف ہو گئے انھوں نے کہا کہ عوام کو ''پر امن مظاہرہ'' کا پابند رکھنا انتہائی حد تک مشکل ہے۔ اس لئے اہم اپنی اصلاحی جدوجہد کو مظاہرہ کے بغیر چلائین گے۔ اس کے بعد فیبین سوسائٹی پریس، اجتماعات، علمی ریسرچ وغیرہ جیسے غیر مظاہراتی طریقوں کی پابند رہ کر کام کرنے لگی۔ فیبین سوسائٹی نے تدریجی طریقہ کار کی ناگزیریت (Ineviableness of gradualism) پر زور دیا۔ اس تحریک کے لوگ سوشلزم کو مانتے تھے مگر وہ ارتقائی سوشلزم کا عقیدہ رکھتے تھے نہ کہ انقلابی سوشلزم کا:

The Fabians put their faith in evolutionary socialism
rather than in revolution (4/20).

غیر مظاہراتی طریق عمل اختیار کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ موجودہ دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ اس کام میں اپنے آپ کو روکنا پڑتا ہے۔ توسیع کے بجائے استحکام پر قانع ہونا پڑتا ہے۔ شہرت اور مقبولیت کے مواقع ہوتے ہوئے اپنے آپ کو گمنامی میں دفن کرنے کے لیے راضی ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ فیبین سوسائٹی کے ساتھ یہ سب کچھ پیش آیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فیبین سوسائٹی نے برطانیہ میں ایک زبردست تاریخ بنائی۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ برطانی عظمت کو قائم کرنے کے لیے اس کے رہنماؤں کو اپنی ذاتی عظمت سے دست بردار ہو جانا پڑا۔

اپنے معتدل طرز فکر اور اپنے غیر عوامی طریق کار کی فیبین سوسائٹی کو یہ قیمت دینی پڑی کہ وہ کبھی برطانیہ کی مقبول عام تحریک نہ بن سکی۔ 1946 کا زمانہ اس کا عروج کا زمانہ شمار کیا جاتا ہے۔ مگر اس عروج کے زمانہ میں بھی فیبین سوسائٹی کے ممبروں کی تعداد 8400 سے زیادہ نہ تھی۔ وہ ہمیشہ ''خواص'' کی تحریک شمار کی جاتی رہی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ فیبین سوسائٹی نے اپنی خاموش فکری سرگرمیوں کے ذریعہ برطانیہ کے ذہنی طبقہ پر گہرا اثر ڈالا۔ ملک کی عام آبادی میں اس کے ارکان کی تعداد اگرچہ ایک فی صد سے زیادہ نہ تھی۔ مگر اعلیٰ ترین اذہان کی قابل لحاظ تعداد اس سے متاثر ہوگئی۔ چنانچہ اس کے ممبروں کی فہرست میں جارج برناڈ شا، سڈنی ویب اور کلیمنٹ اٹیلی جیسے لوگوں کے نام شامل ہیں۔

فیبین سوسائٹی کے ارکان اگلے مرحلہ میں برطانیہ کی لیبر پارٹی میں شریک ہو گئے۔ یہ لوگ لیبر پارٹی میں اس حد تک دخیل ہوئے کہ وہ اس کا دماغ بن گئے۔ چنانچہ 1945 کے انتخابات میں لیبر پارٹی برطانیہ میں برسر اقتدار آئی تو اس کے ممبران پارلیمنٹ کی نصف تعداد وہ تھی جو فیبین سوسائٹی سے تعلق رکھتی تھی۔ پارٹی کے لیڈر کلیمنٹ اٹیلی بھی اس کے ایک ممبر تھے۔ فیبین سوسائٹی ملک کی مجموعی آبادی میں بمشکل ایک فی صد تھی مگر حکمراں پارٹی میں اس کی تعداد پچاس فی صد تک پہنچ گئی۔

1945 سے پہلے برطانیہ میں سرونسٹن چرچل کی پارٹی برسر اقتدار تھی۔ اس وقت برطانیہ کے نوآبادیاتی مقبوضات میں آزادی کی تحریکیں چل رہی تھیں۔ بظاہر برطانیہ کی طاقت ان

تحریکوں کو دبانے میں ناکام ثابت ہورہی تھی۔مگر چرچل نے برطانی مقبوضات کوآزاد کرنے کا مطالبہ بے نیازانہ طور پر رد کر دیا۔انھوں نے پارلیمنٹ میں اپنی تاریخی تقریر میں کہا تھا کہ وہ ملک معظم کے وزیر اعظم اس لئے نہیں بنے ہیں کہ سلطنت برطانیہ کے خاتمہ کی تقریب کی صدارت کریں:

He had not become His Majesty's first minister to preside over the liquidation of His Majesty's empire.

ونسٹن چرچل کی پالیسی برطانیہ کواسی قسم کے انجام کی طرف لے جانے والی تھی جہاں ہٹلر نے جرمنی کو پہنچایا تھا۔یعنی اپنے مقبوضہ ممالک سے پرتشدد جنگ اور بالآخر ظلم کا ٹائٹل لے کران کی آزادی پر راضی ہونا۔

مگر 1945 میں جب لیبر پارٹی برسر اقتدار آئی تو اس نے اپنے فیبین ممبروں کے زیر اثر پورے معاملہ پر از سر نو غور کرنا شروع کیا۔ان کے حقیقت پسندانہ اندازفکر نے انھیں بتایا کہ نو آبادیاتی ممالک کوموجودہ حالات میں زیادہ دیر تک اپنے قبضہ میں رکھنا ناممکن ہے۔جدید حالات کے نتیجہ میں بہر حال ایک نہ ایک دن وہ آزاد ہو کر رہیں گے۔لیکن اگر برطانیہ پرامن طور پر انھیں آزاد کر دے تو یہ اس کے لیے کھونے سے زیادہ پانے کے ہم معنی ثابت ہوگا۔یہ دراصل فیبین دماغ ہی تھا جس کے تحت برطانیہ نے 1947 میں یہ تاریخی فیصلہ کیا کہ وہ ہندستان کی (اوراس کے بعد دوسرے ممالک کو) پُرامن طور پر آزاد کردے۔

اس حقیقت پسندانہ فیصلہ کا زبردست فائدہ برطانیہ کو ملا۔ایک طرف اس کے عالمی اقتصادی فائدے بڑی حد تک محفوظ رہے۔دوسری طرف برٹش کامن ویلتھ کی صورت میں اس نے مزید کم از کم نصف صدی تک اپنے عالمی سیاسی وقار کا تحفظ کرلیا۔

ہمارے لئے سبق

ہندستان کے حالات نے اگرچہ اس کی اجازت نہ دی کہ یہاں کوئی شخص ''ہٹلر'' بن سکے۔مگرایک اعتبار سے ہمارے اکثر لیڈر ہٹلر ہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ہمارے ملک

کے بیشتر لیڈر خواہ وہ کمیونٹی لیڈر ہوں یا قومی لیڈر، یہی کرتے رہے ہیں کہ وہ فرقہ یا قوم کو پیش آنے والی کسی مصیبت کو لے کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ وہ بگڑے ہوئے حالات کی پوری ذمہ داری وقت کی حکومت پر دال کر اس کے خلاف دھواں دھار تقریریں شروع کر دیتے ہیں۔ جلسہ، جلوس، اخباری بیانات کا ہنگامہ کھڑا ہوجاتا ہے، اور ان سب کا رخ ہمیشہ حکومت وقت کی طرف ہوتا ہے۔

عوام اپنی مخصوص نفسیات کی بنا پر جوق در جوق ایسے لیڈروں کا ساتھ دیتے ہیں۔ ان کے گرد بہت جلد عوام کی بھیڑ جمع ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اس میں کامیاب ہوجاتے ہیں کہ وقت کی حکومت کا خاتمہ کر دیں۔ مگر اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ یہ کہ حالات پہلے سے بھی زیادہ بدتر ہوجاتے ہیں۔ کسی کا یہ قول اس قسم کے تمام انقلابات پر صادق آتا ہے کہ انقلاب اس بات کی ایک کامیاب کوشش ہے کہ ایک بری حکومت کو ختم کر کے اس سے بھی زیادہ بری حکومت کو اپنے اوپر مسلط کرلیا جائے۔

A revolution is a successful effort to get rid of a bad government and set up a worse.

وقت کی ضرورت

آج کی سخت ترین ضرورت یہ ہے کہ ملک میں فیبین سوسائٹی کے طرز کی تحریکیں اٹھائی جائیں، کمیونٹی کی سطح پر بھی اور قومی اور ملکی سطح پر بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی کے فوراً بعد مہاتما گاندھی نے اسی قسم کی ایک جماعت کا نقشہ پیش کیا تھا اور اس کا نام انھوں نے جن کانگرس رکھا تھا۔ گاندھی جی کا کہنا یہ تھا کہ سیاسی آزادی مل جانے کے بعد اب ہمارے سامنے ملک کی تعمیر کا زیادہ بڑا کام ہے۔ اس لئے ہمیں ایک غیر سیاسی جماعت کی ضرورت ہے۔ اس جماعت کا کام عوام کی ذہنی تربیت ہوگا اور وہ انتخابی سیاست سے الگ رہ کر خالص تعمیری انداز میں کام کرے گی۔ ''جن کانگرس'' کی کامیابی کے لیے ضروری تھا کہ کانگریس کے بڑے بڑے لیڈر عہدہ اور اقتدار کا راستہ چھوڑ کر خاموش عمل پر اپنے آپ کو راضی کریں اور پوری توجہ کے ساتھ اس میں لگ جائیں۔ مگر کوئی لیڈر اس سیاسی قربانی کے لیے تیار نہیں ہوا۔ اور گاندھی جی کی موت کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

ترقی اور اتحاد

آج کل جو چیز سب سے زیادہ بحث کا موضوع بنی ہوئی ہے وہ قومی ایکتا (کلچرل انٹگریشن) ہے۔ وسیع تر معنوں میں اس کو انسانی ایکتا بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ایکتا آج ہماری بہت بڑی ضرورت ہے۔ اسی پر ملک کی ترقی اور کامیابی کا دارومدار ہے۔ مگر اس معاملہ میں بولنے والے جو کچھ بول رہے ہیں یا لکھنے والے جو کچھ لکھ رہے ہیں ان کو دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس بارے میں لوگوں کا ذہن صاف نہیں کہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں اس کو حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

اکثر لوگوں کی طرف سے یہ کہا جارہا ہے کہ نیشنل انٹگریشن کا ذریعہ کلچرل انٹگریشن ہے۔ یعنی لوگوں میں ایکا پیدا کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ ان کا کلچر ایک کردیا جائے۔ زبان، مذہبی رسوم، لباس، تیوہار شادی بیاہ، اس قسم کی تمام چیزوں کو سب کے لیے یکساں اور مشترک بنادیا جائے۔ اس طرح لوگوں کے اندر وہ ایکتا یا انٹگریشن پیدا ہوجائے گا جس کی ہمیں ضرورت ہے۔

مگر اس تجویز کو میں ایسا ہی سمجھتا ہوں جیسے کسی ملک مین تمام باشندوں کے درمیاں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لیے یہ تجویز پیش کی جائے کہ پلاسٹک سرجری کے ذریعہ تمام انسانوں کو ایک نقشہ کا بنادیا جائے۔ جس طرح یکساں قسم کی پلاسٹک سرجری کے ذریعہ مختلف قسم کے لوگوں میں اتحاد پیدا نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح مذکورہ قسم کی تدبیروں سے قومی ایکتا یا نیشنل انٹگریشن بھی پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی ایکتا کا راز ایک کلچر میں نہیں ہے بلکہ ایک ذہن میں ہے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں لوگوں کے اندر اس کے موافق سوچ پیدا کرنی ہوگی۔ پلاسٹک سرجری جیسا کوئی عمل ظاہری نقشہ کو بدل سکتا ہے مگر وہ اندرونی سوچ کو نہیں بدل سکتا۔ اور محض ظاہری چیزوں کو ایک کردینے سے کبھی حقیقی ایکتا نہیں آسکتی۔

لینن اور اتاترک

حقیقت یہ ہے کہ قومی ایکتا کا معاملہ ہو یا اور کوئی معاملہ، ہر چیز سوچ کی سطح پر ختم ہوتی ہے

اور سوچ ہی کی سطح پر دوبارہ اسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس معاملہ کی وضاحت کے لیے ایک تقابلی مثال لیجئے۔ یہ تقابلی مثال لینن (1870-1924) اور اتاترک (1881-1938) کی ہے۔ دونوں تقریباً ہم زمانہ تھے۔ دونوں کو یکساں طور پر اقتدار ملا۔ مگر لینن کا نام کامیابی کی علامت ہے اور اتاترک کا نام ناکامی کی علامت۔

کمال اتاترک کو ترکی میں 1919 میں اقتدار ملا اور 1938 تک (19 سال) جاری رہا۔ کمال اتاترک نے چاہا کہ ترکی اور یورپ کی دوئی کو مٹا دے اور ترقی کے نقشہ پر دونوں کو یکساں مقام دیدے۔ اس کا راز اس نے ''کلچرل یکسانی'' میں دریافت کیا۔ اس نے ریاستی قوت کے ذریعہ یہ کوشش کی کہ ترکی کے لوگ یورپ والوں کی طرح ہیٹ اور پتلوں پہنیں۔ وہ اہل یورپ کے آداب اختیار کریں۔ حتی کہ کمال اتاترک نے ترکی زبان کا رسم الکط بدل کر اس کو یورپی رسم الخط میں لکھنے کا حکم دیا جو اس سے پہلے عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ وغیرہ۔

کمال اتاترک نے ان ''اصلاحات'' کو بزور پورے ترکی میں نافذ کر دیا۔ مگر ان اصلاحات کے نفاذ پر تقریباً ستر سال گزرنے کے بعد بھی ترکی بدستور ایک مریض اور پسماندہ ملک ہے۔ یورپ کے نقشہ میں وہ ترقی یافتہ ملک کا درجہ حاصل نہ کر سکا۔

اس کے برعکس مثال لینن کی ہے۔ لینن کو روس میں 1917 میں اقتدار ملا اور 1924 تک (7 سال) جاری رہا۔ حالات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اس نے جانا کہ موجودہ زمانہ کی اصل طاقت سائنس ہے۔ اس نے پہلا کام یہ کیا کہ روس میں بڑے پیانہ پر ایک دار الترجمہ قائم کیا۔ جس کے کارکنوں کی تعداد بعد کے مرحلہ میں، ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ اس نے حکم دیا کہ جرمن، فرنچ، انگلش وغیرہ زبانوں سے تمام سائنسی کتابوں کا ترجمہ روسی زبان میں کیا جائے۔ یہ کام اعلیٰ پیانہ پر شروع ہو گیا اور برابر جاری رہا۔ یہ صحیح رخ پر صحیح اقدام تھا۔ چنانچہ روس کو اس کا یہ فائدہ ملا کہ وہ آج دو سپر پاور میں سے ایک سپر پاور کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ ہے تدبیر کا فرق۔ کمال اتاترک نے ترکی اور یورپ کے درمیان کلچر کے فرق کو مٹانا چاہا۔ مگر دونوں کے درمیان کلچر کے فرق کو مٹا دینے کے بعد بھی اس کو کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ اس

کے برعکس لینن نے روس اور یورپ کے درمیان علم وشعور کے فرق کو مٹانے کا منصوبہ بنایا۔ چنانچہ جب یہ فرق مٹا تو روس دنیا کی دوسری سب سے بڑی طاقت بن چکا تھا۔

یہ مثال بتاتی ہے کہ ہمیں غیر متعلق کارروائیوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ ہماری کارروائیوں کی تکمیل کے بعد بھی اصل مسئلہ وہیں باقی رہے گا جہاں وہ آج ہمیں دکھائی دے رہا ہے۔

چند مثالیں

ہمارے آس پاس جو واقعات ہیں ان کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو یہ بات نہایت آسانی کے ساتھ سمجھی جاسکتی ہے کہ کلچر کا فرق یا کلچر کی یکسانیت اضافی چیزیں ہیں۔ ایکتا سے ان کا کوئی لازمی تعلق نہیں۔ چند مثالیں لیجئے۔

بمبئی میں پارسی اور ہندو ہزار برس سے ایک ساتھ رہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ پارسی سماج ایک بند سماج ہے۔ وہ لوگ اپنے سے باہر شادی بیاہ کو صحیح نہیں سمجھتے چنانچہ بمبئی کے ہندوؤں اور پارسیوں میں آپس میں شادی بیاہ نہیں ہوتا۔ اگر کوئی مثال اس سے مختلف ہو تو وہ ایک نادر استثناء ہے نہ کہ کوئی عام قاعدہ۔ اس کے باوجود آج تک وہاں کبھی ہندوؤں اور پارسیوں میں لڑائی نہیں ہوئی۔ دونوں کے درمیان معیاری حد تک پرامن تعلقات ہیں۔ اس کے برعکس مثال ہندوؤں اور سکھوں کی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندوؤں اور سکھوں میں باہمی شادی کا بے روک ٹوک رواج تھا۔ مگر انھیں دونوں فرقوں میں آج پنجاب میں اتنے بڑے پیمانہ پر لڑائی ہو رہی ہے جیسے کہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہوں۔ یہ سلسلہ بھنڈراں والا اور آپریشن بلو اسٹار (اپریل 1986) کے وقت سے پوری شدت کے ساتھ جاری ہے۔ اور ہر قسم کی کوششوں کے باوجود ابھی تک وہ ختم نہ ہوسکا۔

اسی طرح مثلاً کہا جاتا ہے کہ تمام فرقوں کی زبان ایک ہو جائے تو اس کے بعد لوگوں کے درمیان ایکتا پیدا ہو جائے گی۔ مگر یہ بھی ایک غیر متعلق اور غیر مفید تجویز ہے۔ سوئزرلینڈ میں کئی زبانیں رائج ہیں۔ ان میں سے تین زبانوں کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ فرنچ،

جرمن، اٹالین۔ مگر زبانوں کی کثرت کے باوجود ان کے درمیان کامل اتحاد اور ایکتا پایا جاتا ہے۔ بلکہ سوئزر لینڈ موجودہ دنیا کا سب سے زیادہ پُر امن ملک ہے۔ اس کے برعکس مثال پاکستان کی ہے۔ وہاں باقاعدہ طور پر صرف ایک سرکاری زبان ہے، یعنی اُردو۔ اس کے باوجود پاکستان میں اتنے زیادہ باہمی جھگڑے ہیں کہ پاکستان کے قیام پر چالیس سال سے زیادہ بیت گیے مگر آج تک وہاں کا جھگڑا ختم نہیں ہوا۔

اس طرح کی بے شمار مثالیں ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ یک جہتی اور اتحاد کا تعلق لوگوں کی سوچ سے ہے نہ کہ ان کے ظاہری رسوم اور آداب سے۔ ملک کے باشندوں میں اگر صحیح سوچ موجود ہو اور وہ زندگی گزارنے کا راز جانتے ہوں تو وہ ظاہری فرق کے باوجود مل جل کر رہیں گے۔ اس کے برعکس اگر ان کی سوچ درست نہ ہو، وہ زندگی کے راز سے واقفیت نہ رکھتے ہوں تو وہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہیں گے، خواہ ان کی ظاہری نشانات ایک جیسے کیوں نہ ہوں حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے معاملات کی درستگی میں اصل اہمیت طرز فکر (Attitude of mind) کی ہے۔ اگر ہم اس ملک میں یک جہتی اور مفاہمت پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں لوگوں کے طرز فکر کو درست کرنا ہوگا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کا یہی واحد راستہ ہے۔ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔

یہ واحد راستہ احترام اور رواداری کا راستہ ہے۔ لوگوں میں یہ مزاج پیدا کیا جائے کہ وہ دوسروں کے ساتھ روادارانہ برتاؤ کریں۔ وہ ہر آدمی کا احترام کریں، خواہ وہ اپنی برادری کا ہو یا اپنے سے باہر کی برادری کا۔ یہی مزاج اتحاد اور یک جہتی کی اصل بنیاد ہے۔ یہ مزاج جہاں ہوگا وہاں اتحاد ہوگا، جہاں یہ مزاج نہ ہو، وہاں کسی اور تدبیر سے اتحاد پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن کی رہنمائی

اب میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ اس معاملہ میں ہمیں قرآن سے کیا رہنمائی ملتی ہے۔ یہ رہنمائی ایک لفظ میں، یہ ہے کہ انسان کے سوا بقیہ کائنات جس قانون پر چل رہی ہے، اسی کو انسان بھی اختیار کر لے۔ کائنات واضح طور پر مختلف اور متفرق اجزاء کا مجموعہ ہے۔ اس میں آگ بھی ہے اور پانی بھی۔ اس میں نازک پودے بھی ہیں اور سخت پتھر بھی۔ اس

میں دن کی روشنی بھی ہے اور رات کی تاریکی بھی۔مگر ان تمام اختلافات کے باوجود، پوری کائنات ایک ہم آہنگ کُل کی طرح عمل کرتی ہے۔ یہ گویا ایک خدائی ماڈل ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ بھی اسی ماڈل کو اپنے لیے رہنما بنالے۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اور بقیہ کائنات دونوں ایک اکائی کے دو حصے ہیں۔ دونوں میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ انسان ذاتی شعور اور ذاتی ارادہ رکھتا ہے، جب کہ کائنات کی دوسری چیزیں ذاتی شعور اور ذاتی ارادہ نہیں رکھتیں۔ جامد مادہ قانونِ فطرت (Law of nature) سے کنٹرول ہوتا ہے اور جاندار چیزیں اپنے اندر چھپی ہوئی جبلت (Instinct) سے۔

قرآن کے مطابق، کائنات کا جو دین (نظام عمل) ہے۔ وہی انسان کا دین (نظام عمل) بھی ہے۔ دونوں کی کامیاب کارکردگی کا راز ایک ہی فطری نقشہ میں چھپا ہوا ہے۔قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا (کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں، حالاں کہ اسی کے تابع ہے وہ سب کچھ جو زمین و آسمان میں ہے، خوشی سے یا ناخوشی سے)

دوسرے مقام پر ارشاد ہوا ہے کہ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (زمین میں فساد نہ کرو اس کی اصلاح کے بعد) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمین میں انسان کو بسایا گیا ہے وہ ایک اصلاح یافتہ زمین ہے۔اس کے تمام اجزاء صحیح ترین کارکردگی پر قائم ہیں۔ان میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں۔اب انسان کو چاہیے کہ وہ اس نافذ شدہ نظام اصلاح سے مطابقت کر کے زمین پر زندگی گزارے۔ اگر وہ اس نقشہ سے مطابقت نہ کرے تو یہ زمین پر فساد برپا کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ کسی مجموعہ کا ایک جزء اگر مجموعہ سے مطابقت کر کے رہے تو نظام درست رہے گا۔ اور اگر مجموعہ کا کوئی جزء اصل مجموعہ کے غیر مطابق ہوجائے تو پورا نظام بگڑ جائے گا۔ یہ اصلاحی نقشہ میں فساد برپا کرنے کا موجب بن جائے گا۔

اس کو ایک لفظ میں کائناتی پیٹرن کہا جا سکتا ہے۔ جو کائناتی پیٹرن کائنات کو کامیابی کے

ساتھ چلا رہا ہے، وہی انسان کے لیے بھی مفید اور کامیاب ہے۔

دو پہلو

وہ چیز جس کو ہم نے کائناتی پیٹرن کہا ہے، اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک فنی (ٹکنکل) پہلو، دوسرا اخلاقی (اتھیکل) پہلو۔ جہاں تک کائناتی پیٹرن کے ٹکنکل پہلو کا تعلق ہے، اس معاملہ میں انسان نے عین وہی کیا ہے جو اسے ازروئے واقعہ کرنا چاہیے۔ وہ اس معاملہ میں حد درجہ سنجیدہ ہے۔ وہ انتہائی محنت سے اس کو دریافت کرتا ہے اور اس کی کامل پیروی کرتا ہے۔ کائناتی پیٹرن کے ٹکنکل پہلو سے وہ ادنی درجہ میں بھی انحراف نہیں کرتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ٹکنکل پہلو کی کامل پیروی ہی کے ذریعہ وہ تمدنی ترقیاں حاصل کرسکتا ہے۔ مگر کائناتی پیٹرن کے اخلاقی پہلو کے بارے میں اس کا رویہ یکسر مختلف ہے۔ یہاں وہ پیروی کے بجائے انحراف کی روش اختیار کرتا ہے۔

اس معاملہ کی وضاحت کے لیے ایک سادہ مثال لیجئے۔ اس حال میں ہمارے سامنے دو واقعے نظر آرہے ہیں۔ ایک بجلی جو ہم کو روشنی دے رہی ہے، دوسرے پنکھا جس سے ہمیں ٹھنڈی ہوا ملتی ہے۔ یہ دونوں چیزیں کائناتی پیٹرن کے ٹکنکل پہلو کی پیروی کر کے حاصل کی گئی ہیں۔ کائنات میں قانونِ قدرت کے تحت پیشگی طور پر ایک امکان موجود ہے۔ وہ یہ کہ اگر آپ ایک ایسی مشین بنائیں جس میں میگنیٹک فیلڈ (مقناطیسی میدان) اور موشن (حرکت) کو یکجا کیا گیا ہو تو فوراً اس کے اندر الکٹران متحرک ہوجائیں گے اور وہ چیز پیدا ہوجائے گی جس کو کرنٹ (بجلی) کہتے ہیں۔ جنریٹر میں اسی طریقہ کو استعمال کر کے بجلی پیدا کی جاتی ہے جس سے بلب روشن ہوتا ہے اور دوسرے کام کیے جاتے ہیں۔

کائناتی پیٹرن کا ایک اور ٹکنکل پہلو یہ ہے کہ اگر آپ ایک ایسی مشین بنائیں جس میں میگنیٹک فیلڈ (مقناطیسی میدان) اور کرنٹ (بجلی) کو یکجا کیا جائے تو فوراً اس کے اندر موشن (حرکت) پیدا ہوجائے گی، یہی قدرتی تدبیر ہے جس کے ذریعہ حرکت پیدا کر کے پنکھا چلایا جاتا ہے اور دوسری تمام مشینیں متحرک کی جاتی ہیں۔

یہ کائناتی پیٹرن کے ٹکنکل پہلو کی مثال ہے۔ دنیا کے تمام انسان، خواہ وہ کسی بھی قوم یا فرقہ سے تعلق رکھتے ہوں، وہ اس پہلو کی صد فی صد پیروی کرتے ہیں۔ وہ بال برابر بھی اس سے نہیں ہٹتے۔ کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ یہاں نتیجہ کا یا بالفاظ دیگر، صحیح کارکردگی کا انحصار، تمام تر اس پر ہے کہ خارجی قانون کی کامل پیروی کی جائے۔

مذکورہ مثال بتاتی ہے کہ کائناتی پیٹرن میں ٹکنکل پہلو پایا جاتا ہے۔ یہی مثال یہ بھی بتاتی ہے کہ کائناتی پیٹرن میں ایک اور متعین پہلو موجود ہے۔ اس کو باعتبار نوعیت، اخلاقی پہلو (ایتھیکل پہلو) کہا جا سکتا ہے۔ اس سے میری مراد کائنات میں پیشین گوئی کیے جانے کی قابلیت (Predictability) ہے۔ کائنات مکمل طور پر قابل پیشین گوئی کردار (Predictable Character) کی حامل ہے۔ مثلاً مذکورہ بالا مثال میں، غیر متغیر طور پر یہ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے کہ جب بھی میگنیٹک فیلڈ اور موشن کو یکجا کیا جائے گا تو لازماً وہاں کرنٹ پیدا ہو جائے گی۔ اسی طرح جب بھی میگنیٹک فیلڈ اور کرنٹ کو یکجا کیا جائے گا تو لازماً موشن پیدا ہو جائے گا۔ کائنات کا اس طرح قابل پیشین گوئی ہونا گویا اس کا وہ پہلو ہے جس کو انسان زبان میں اخلاقی (ایتھیکل) پہلو کہا جاتا ہے۔

موجودہ دنیا میں ہم یہ تضاد دیکھ رہے ہیں کہ ہماری ٹکنالوجی نہایت صحت کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہے۔ وہ ہمیشہ وہی مطلوبہ نتیجہ برآمد کرتی ہے جس کی اس سے امید کی گئی ہے۔ اس کے برعکس انسان غیر صحیح بنا ہوا ہے، انسان اس مطلوبہ معیار پر پورا نہیں اترتا جس کی اس سے بجا طور پر امید قائم کی گئی ہو۔ اس تضاد کا واحد سبب یہ ہے کہ انسان نے کائناتی پیٹرن کے ٹکنکل پہلو کو تو پوری طرح اپنایا، مگر وہ اس کے اخلاقی پہلو کو اپنانے کے لیے تیار نہ ہو سکا۔

قابلِ پیشین گوئی کردار

قرآن میں پسندیدہ بندوں کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ اپنے عہد کو پورا کرنے والے لوگ ہیں جب کہ وہ کسی سے عہد کر لیں۔ یہ عین وہی اخلاقی صفت ہے جس کو ہم نے قابل پیشین گوئی کردار (Predictable Character) سے تعبیر کیا ہے۔ جس طرح لوہے کے اوپر کسی

چھت کو کھڑا کیا جائے تو پیشگی طور پر یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ چھت کے بوجھ کو سنبھالے گا۔ اسی طرح جب ایک انسان دوسرے انسان سے کوئی عہد کرے تو پیشگی طور پر یہ اعتماد ہونا چاہیے کہ وہ ضرور اس عہد کو پورا کرے گا، وہ کسی حال میں اس سے نہیں ہٹے گا۔

اسی بات کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ منافق آدمی کی تین نشانیاں ہیں ۔۔۔ جو وہ بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب وہ وعدہ کرے تو اس سے پھر جائے۔ جب اس کو امانت سپرد کی جائے تو وہ امانت میں خیانت کرے۔(آیة المنافق ثلاث ۔ اذا حدث کذب و اذا وعد اخلف و اذا ائتمن خان)

مذکورہ تینوں باتیں قابل پیشین گوئی کردار کے خلاف ہیں۔ کسی انسان سے جب بات کی جاتی ہے تو اس اعتماد پر کی جاتی ہے کہ وہ صحیح بات کہے گا، وہ غلط بیانی سے کام نہیں لے گا۔ اب اگر وہ خلاف واقعہ بات بولنے لگے تو اس نے پیشگی اندازہ کے خلاف عمل کیا۔ اسی طرح جب کسی سے عہد و پیمان کیا جاتا ہے تو اس یقین کی بنیاد پر کیا جاتا ہے کہ اس کا آئندہ عمل عین اس عہد کے مطابق ہوگا۔ اب اگر آدمی اپنے کیے ہوئے عہد کے خلاف کرنے لگے تو اس نے اپنے بارے میں پیشگی اندازہ کو پورا نہیں کیا۔ اسی طرح جب کوئی امانت کسی کے حوالے کی جاتی ہے تو وہ بھی اس پیشگی اعتماد کی بنیاد پر کی جاتی ہے کہ وہ ادائیگی کے وقت امانت کو پوری طرح ادا کرے گا۔ اب اگر بوقت ادائیگی وہ امانت کو اس کے حق دار کی طرف نہ لوٹائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ قابل پیشین گوئی کردار کا حامل نہ تھا۔

کائنات اپنے قابل پیشین گوئی کردار کی وجہ سے کامل ہے، اسی طرح انسان بھی اس وقت کامل ہوسکتا ہے کہ وہ قابل پیشین گوئی کردار کا حامل بنے۔

کثرت میں وحدت

کائنات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کثرت میں وحدت کا اصول کارفرما ہے۔ یعنی چیزیں بظاہر مختلف اور متعدد ہیں۔ مگر جب ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام چیزیں اپنی آخری حقیقت کے اعتبار سے ایٹم (Atom) کا مجموعہ ہیں۔ ہر چیز بالآخر ایٹم

ہے، خواہ بظاہر وہ کچھ بھی دکھائی دیتی ہو۔

یہی کائناتی پیٹرن انسانوں کے اندر بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ انسان بظاہر دیکھنے میں ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔ ان میں رنگ اور دوسری چیزوں کے اعتبار سے بہت سے فرق پائے جاتے ہیں۔ مگر ان کا تاریخی تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تمام نسلیں آخرکار ایک ماں باپ پر جا کر ختم ہوتی ہیں۔ گویا سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں نہ کہ ایک دوسرے کے غیر۔

یہی بات قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا نکالا، اور پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورت زمین پر پھیلا دیئے۔ (يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَاءً)(النسا:۱)

یہی بات حدیث میں اس طرح آئی ہے (سن لو کہ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے تھے) وحدت انسانیت کا یہ تصور ہر انسان کے دل میں دوسرے انسان کے لیے محبت اور خیر خواہی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ وہ پوری انسانی نسل کو ایک خاندان اور ایک برادری کی مانند بنا دیتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ۔

تمام مخلوق اللہ کی کنبہ ہے۔ پس تمام لوگوں میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کے کنبہ کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

کائناتی ماڈل کثرت میں وحدت کی صفت رکھتا ہے۔ انسان کو بھی اسی کائناتی ماڈل پر اپنی زندگی کا نقشہ بنانا چاہیے۔ اس کو کئی میں ایک کا نمونہ بن جانا چاہیے۔ کائنات میں جب کثرت میں وحدت (Unity in diversity) کا اصول کارفرما ہے، تو انسان کے لیے درست نہیں کہ وہ یہاں کثرت کو ایک کرنے (Unification of diversity) کے طریقہ پر زندگی کا نظام بنانے کی کوشش کرے۔

حیاتیاتی اخوت

وحدت انسانیت یا وحدتِ بنی آدم کی حقیقت جس کا اعلان پیغمبر اسلام نے چودہ سو سال پہلے کیا تھا، اب وہ جدید تحقیقات کے نتیجہ میں ایک سائنسی واقعہ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔

موجودہ زمانہ میں مالے کیول حیاتیات (Molecualr biology) نے بہت ترقی کی ہے۔ ڈی این اے (DNA) کے ذریعہ گہری نسلی رازوں کو دریافت کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ چنانچہ امریکہ میں چین کے ماہرین (Geneticists) کی ایک ٹیم نے یہ کام اپنے ذمہ لیا کہ وہ انسان کے مشترک جد اعلیٰ (Common ancester) کو دریافت کریں گے۔ ڈی این اے کے طریقہ میں ابتدائی باپ (Great-grandfather) کو دریافت کرنا زیادہ مشکل تھا۔ انھوں نے (Great-grandmother) (ابتدائی ماں) کا پتہ لگانے پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دی۔

ان حیاتیاتی سائنس دانوں نے مختلف علاقوں کی 147 حاملہ خواتین کو تیار کیا کہ وہ غیر مولود بچہ کے مادے (Placentas) انھیں بطور عطیہ دیں۔ اس مادہ پر وہ سالہا سال تک امریکہ کی ایر کنڈیشنڈ لیبارٹریوں میں تحقیق کرتے رہے جو برکلے میں واقع تھیں۔ انھوں نے ان سے جسمانی نسیج (Body tissue) کے نمونے نکالے اور ان پر طرح طرح سے تجربات کیے۔ آخر کار انھوں نے اعلان کیا ہے کہ انھوں نے پہلی خاتون (First woman) یا مذہبی اصطلاح میں حوا (Eve) کو دریافت کر لیا ہے۔ سائنس دانوں کے نزدیک یہ خاتون 200 ہزار سال پہلے زمین پر آباد تھی۔ وہ تمام انسانوں کی مشترک ماں ہے، وہ ہم سب کی تقریباً 10,000 ویں دادی ہے۔

تحقیقات نے بتایا ہے کہ وہ تمام ظاہری فرق جن کی بنیاد پر نسلی اختلاف یا اونچی نسل اور نیچی نسل کے نظریات بنائے گیے تھے، وہ محض وقتی اور سطحی تھے۔ مثال کے طور پر جِلد کا رنگ محض آب و ہوا سے مطابقت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ افریقہ میں کالا رنگ سورج سے بچاؤ کے لیے، یورپ میں سفید الٹرا وائلٹ شعاعوں کو جذب کرنے کے لیے جو کہ وٹامن ڈی کی پیدائش میں

مددگار رہے۔ جلد کا رنگ صرف چند ہزار سال کے عمل سے بدل جاتا ہے:

Skin color , for instance is a minor adaptation to climate.. Black in Africa for protection from the sun, White in Europe to absorb ultraviolet radiation that helps produce vitamin D. It takes only a few thousand years of evolution for skin colour to change(p.42)

سائنس دانوں نے اپنے نتائج تحقیق کے مطابق اعلان کیا ہے کہ تمام بچوں کے ڈی این اے آخر کار ایک عورت تک جا پہونچتے ہیں۔ پہلی نظر میں یہ نا قابل قیاس دکھائی دے سکتا ہے کہ تمام انسانوں کا حیاتیاتی ذریعہ ایک واحد عورت تھی۔ مگر یہ قانونِ اتفاق کے تحت حاصل ہونے والا ایک نہایت ثابت شدہ نتیجہ ہے:

All the babies 'DNA could be traced back, ultimately to one woman... At first glance it may seem inconceivable that the source of all mitochondrial DNA was a single woman, but it's a well established out come of the laws of probability (p.42).

برکلے کے حیاتیاتی سائنس دانوں (Geneticists) کی مذکورہ ٹیم کے علاوہ ایموری یونیورسٹی (Emory University) کی ٹیم نے بھی اس سلسلہ میں کام کیا ہے۔ اس ٹیم کے سربراہ پروفیسر ڈگلس (Douglas Wallace) تھے۔ اس ٹیم نے مزید یہ امکان ظاہر کیا ہے کہ پہلی خاتون (حوا) ممکن ہے ایشیا کے کسی حصہ میں رہتی ہو:

Eve might have lived in Asia (p.42)

یہ نتیجہ انھوں نے جینی شہادت (Genetic evidence) کی بنیاد پر نکالا ہے جو مختلف براعظموں کے ساتھ سو آدمیوں کے خون کی خصوصی جانچ کے بعد حاصل کیا گیا ہے۔ یہ تحقیق خالص سائنسی سطح پر یہ ثابت کر رہی ہے کہ تمام انسانی نسل، ظاہری فرق کے باوجود، ایک عظیم خاندان (Great family) کی حیثیت رکھتی ہے (صفحہ 44,43)

اسی نوعیت کی تحقیقات انگلینڈ اور فرانس وغیرہ میں بھی ہو رہی ہیں۔ ان تحقیقات پر امریکہ کے کئی سائنسی جرنل میں مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ اس سلسلے میں دو مقالات کا خلاصہ نیو یارک (امریکہ) کے انگریزی ہفت روزہ نیوز ویک (11 جنوری 1988) میں سات صفحات پر شائع ہوا ہے۔

ان تحقیقات کے مطابق جینی شہادت (Genetic evidence) نے اس قدیم خیال کی تردید کردی ہے کہ انسانی نسل مختلف الگ الگ شاخوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا ہے کہ تمام اولاد آدم ایک ہی مشترک انسانی برادری کا حصہ ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر اسٹفن جے گولڈ (Stephen Jay Gould) نے کہا:

> This idea is tremendously important. It makes us realize that all human beings, despite differences in external appearance, are really members of a single entity that's had a very recent origin in one place. There is a kind of biological brotherhood that's much more profound than we ever realized (p.39).

یہ تصور حیرت ناک حد تک اہم ہے۔ یہ ہم کو یقین دلاتا ہے کہ تمام انسان، خارجی ظواہر میں فرق کے باوجود، حقیقتاً ایک ہی واحد نسل کے افراد ہیں جو کہ بہت قریبی عہد میں ایک مقام پر شروع ہوئی تھی۔ یہاں ایک قسم کی حیاتیاتی اخوت ہے جو کہ اس سے بہت زیادہ گہری ہے جو اب تک ہم نے سمجھا تھا۔

وہ اخوت جو حیاتیاتی واقعہ کے طور پر پہلے سے پائی جارہی ہے، اس کو سماجی سطح پر اختیار کر لینا، یہی انسانی اتحاد اور انسانی یک جہتی کا واحد راز ہے۔ یہ اتحاد اور یک جہتی کا وہ فطری نسخہ ہے جس کا اشارہ خود ہماری پیدائشی بناوٹ میں موجود ہے۔ اس تحقیق نے ایک طرف ان تمام نظریات کو باطل ثابت کردیا ہے جو رنگ اور نسل کے فرق کی بنا پر انسانیت کو مختلف گروہوں میں بانٹے ہوئے تھے، دوسری طرف اس نے بتا دیا ہے کہ انسانوں کے درمیان یک جہتی قائم کرنے کی فطری تدبیر کیا ہے۔

تنوع کا اصول

جس دنیا میں ہم رہ رہے ہیں اس کا نظام تنوع اور رنگارنگی کے اصول پر قائم ہے۔ یہی تنوع انسانوں کے درمیان بھی مطلوب ہے۔ ہمیں انسانوں کے درمیان یہ مزاج بنانا چاہیے کہ وہ اختلاف کے باوجود متحد ہوں، وہ مختلف اور متنوع انسانوں کے ساتھ مل کر زندگی گزارنا سیکھیں۔

انسانی ایکتا قائم کرنے کے لیے فرق کو مٹانا قدرت کے نظام کے خلاف ہے، اس لیے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔

مثال کے طور پر جانوروں کو لیجئے۔ جانور کی ایک ملین سے بھی زیادہ قسمیں دنیا میں پائی جاتی ہیں اور ہر ایک کا ایک کام ہے جو اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہاں زمین پر رینگنے والے کیڑوں کی بھی ضرورت ہے جو گندی اور بیکار چیزوں کو (Decompose) کر کے ہماری فضا کو برابر پاک صاف کرتے رہتے ہیں یہاں بیل کی بھی ضرورت ہے جو ہمارے کھیت کو جوتے اور گھوڑے کی بھی ضرورت ہے جو ہماری سواری کے کام آئے۔ ایک طرف اگر یہاں چڑیوں کی ضرورت ہے جو چہچہائیں، تو دوسری طرف گدھے کی بھی ضرورت ہے کہ جب وہ چیخنے تو آپ سوچیں کہ مجھے اس طرح چیخنے کر نہیں بولنا چاہیے۔

یہی معاملہ تمام دوسری چیزوں کا ہے۔ اس دنیامین بے حساب تنوع اور رنگارنگی ہے۔ اس تنوع پر اس کا سارا نظام چل رہا ہے۔ اسی پیٹرن پر انسانوں کے پیدا کرنے والے نے انسانوں کے اندر بھی فرق اور تنوع رکھا ہے۔ اس تنوع کو باقی رکھنے ہی میں انسانیت کی ترقی اور کامیابی ہے۔ اس تنوع کو ختم کرنا ایسا ہی ہے جیسے انسانوں کو یکساں قد کا بنانے کے لیے لوگوں کو نیچے اوپر سے تراش کر برابر کیا جانے لگے۔

حد بندی کا نظام

کائنات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہاں حد بندی کا نظام قائم ہے۔ ہر چیز اپنے متعین دائرہ میں رہ کر اپنا کام کرتی ہے، وہ اپنے دائرہ سے نکل کر دوسرے دائرہ میں داخل نہیں ہوتی۔ یہی بات قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے: اور سورج اپنے مستقر پر چلتا ہے، یہ زبردست علم والے کا باندھا ہوا اندازہ ہے۔ اور چاند کے لیے منزلیں مقرر ہیں۔ یہاں تک وہ ایسا رہ جاتا ہے۔ جیسے کھجور کی ٹہنی۔ نہ سورج کی مجال ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے۔ سب ایک ایک دائرہ میں چل رہے ہیں (یٰس 38-40)

ان آیتوں میں اس فلکیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اس کائنات کے تمام

گھومنے والے ستارے اور سیارے حد درجہ صحت کے ساتھ اپنے اپنے مدار (Orbit) میں گھومتے ہیں۔ وہ کبھی اپنی حد کو چھوڑ کر دوسرے کی حد میں داخل نہیں ہوتے۔

یہی حد بندی انسان سے بھی مطلوب ہے۔ چنانچہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں کی خلاف ورزی کریں وہ اللہ کی نظر میں ظالم ہیں۔ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ○(البقرۃ:229)

یہی بات حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے: وحد حدوداً فلا تعتدوھا (اور اللہ نے حدیں قائم کر دی ہیں تو تم ان حدوں کی خلاف ورزی نہ کرو) ایک اور حدیث میں اس بات کو مثال کے ذریعے اس طرح واضح کیا گیا ہے:

مثل المومن و مثل الایمان کمثل الفرس فی اٰخیته یجول ثم یرجع الیٰ اٰخیته

مومن کی مثال اور ایمان کی مثال ایسی ہے جیسے گھوڑا جو اپنی رسی میں بندھا ہوا ہو۔ وہ گھومتا ہے پھر وہ اپنی رسی کی طرف لوٹ آتا ہے۔

ایک گھوڑے کی گردن میں 5 میٹر کی رسی ہو، وہ رسی ایک کھونٹے سے بندھی ہوئی ہو تو گھوڑا اپنی عادت کے مطابق چاروں طرف گھومے گا مگر وہ رسی کی لمبائی سے زیادہ نہ جا سکے گا۔ رسی اگر 5 میٹر کی ہے تو اس کی حرکت کا دائرہ بھی 5 میٹر تک محدود رہے گا۔

آسمان کے ستارے ایک ان دیکھی رسی میں بندھے ہوئے ہیں جو انھیں ان کے مقرر مدار (Orbit) سے باہر نہیں جانے دیتی۔ اسی طرح انسان کو بھی ایک اخلاقی رسی میں باندھا گیا ہے۔ یہ رسی صحیح اور غلط کی رسی ہے۔ اس کو صحیح کام کرنا ہے مگر غلط کام کی طرف قدم نہیں بڑھانا ہے۔ انسان کو انصاف پر قائم رہنا ہے، اس کو ظلم کرنے کی اجازت نہیں۔ اس کو جب بولنا ہے، سچ بولنا ہے۔ جھوٹ بولنا اس کے لیے جائز نہیں۔ اس کو اپنی ترقی اور کامیابی کے لیے سرگرم ہونے کی اجازت ہے مگر اس کو یہ اجازت نہیں کہ وہ دوسرے کو نقصان پہنچانے کی قیمت پر اپنے لیے فائدہ حاصل کرے۔

یہ حقیقت ایک لطیفہ میں بہت اچھی طرح واضح ہوتی ہے۔ ایک ملک کا واقعہ ہے۔ اس کو

بیرونی اقتدار سے آزادی ملی۔ اس کے بعد وہاں کا ایک شہری سڑک پر نکلا۔ وہ خوشی سے جھومتا ہوا جا رہا تھا اور اپنے دونوں ہاتھ زور زور سے ہلا رہا تھا۔ اس دوران اس کا ہاتھ ایک راہگیر کی ناک سے ٹکرا گیا۔ راہگیر نے غصہ ہو کر پوچھا کہ تم اس طرح ہاتھ ہلاتے ہوئے کیوں چل رہے ہو۔ آہستگی کے ساتھ کیوں نہیں چلتے۔ شہری نے کہا کہ آج میرے ملک کو آزادی مل چکی ہے۔ اب میں آزاد ہوں کہ جو چاہوں کروں۔ راہگیر نے آہستگی کے ساتھ جواب دیا کہ تمہاری آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے:

Your freedom ends where my nose begins

اس دنیا میں ہر آدمی کو عمل کی آزادی ہے۔ مگر ایک شخص کو اپنا ''ہاتھ'' ہلانے کی آزادی وہیں تک ہے جہاں وہ دوسرے کی ''ناک'' سے نہ ٹکرائے۔ جیسے ہی دوسرے شخص کی ناک سے ٹکرانے کی حد شروع ہو، وہیں ہاتھ ہلانے والے کی آزادی کی حد بھی ختم ہو جائے گی۔

ادنیٰ سے اعلیٰ

ایک درخت کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ ادنیٰ کو اعلیٰ بنا سکتا ہے۔ وہ جامد مادہ کو نمو پذیر شے میں تبدیل کرتا ہے۔ وہ باہر سے مٹی اور پانی اور گیس لیتا ہے اور اس کو پتی اور پھول اور پھل کی صورت میں سامنے لے آتا ہے۔ اسی طرح کسی انسانی سماج کے بہتر سماج ہونے کا دار و مدار تمام تر اس پر ہے کہ اس کے افراد یہ صلاحیت رکھتے ہوں کہ وہ ادنیٰ سلوک کو اعلیٰ سلوک میں تبدیل کر سکیں۔

اس معاملہ میں انسان کے نفسیاتی وجود کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے جیسا کہ بنانے والے نے اس کے حیاتیاتی وجود کو بنایا ہے۔ انسان جو چیزیں کھاتا ہے ان میں ایک جزء شکر کا ہوتا ہے۔ شکر اپنی ابتدائی صورت میں انسان کے لیے بے فائدہ ہے۔ چنانچہ انسان کے جسم میں پینکریاز (Pancreas) کا نظام رکھا گیا ہے جس کا عمل سادہ طور پر یہ ہے کہ وہ شکر کو انرجی (طاقت) میں تبدیل کرتا ہے۔ اسی تبدیلی کی صلاحیت پر انسان کی طاقت اور صحت کا انحصار ہے۔ جس آدمی کے جسم کا یہ سسٹم بگڑ جائے، اس کے اندر داخل ہونے والی شکر انرجی میں تبدیل نہیں ہو

گی۔ وہ یا تو خون میں شامل ہو جائے گی یا پیشاب کے راستہ سے باہر آنے لگے گی۔ اس کے بعد انسان بے حد کمزور ہو جائے گا۔ اسی سے وہ مہلک بیماری پیدا ہوتی ہے جس کو ذیابطیس (Diabetes) کہا جاتا ہے۔

اگر ایک آدمی ذیابیطس کا مریض (Diabetic) ہو جائے۔ یعنی اس کا جسمانی نظام شکر کو انرجی میں تبدیل کرنے کی صلاحیت کھو دے تو زندگی اس کے لیے بے معنی ہو جائے گی۔ وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بے کچھ ہو جائے گا۔ اسی طرح جو سماج اس مزاج سے خالی ہو جائے۔ یعنی اس کے افراد ادنی سلوک کو اعلیٰ سلوک میں ڈھالنے کا ثبوت نہ دے سکیں، ایسا سماج ایک بیمار سماج ہے۔ ایسے سماج کو درست کرنے کی کوئی بھی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ اس کے اندر دوبارہ یہ اعلیٰ صلاحیت پیدا کی جائے۔

آج کل ہمارے سماج میں جو بگاڑ اور ٹکراو پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ لوگوں کے درمیان تہذیبی فرق ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہمارے سماج کے افراد نفسیاتی اعتبار ڈائبٹک ہو گیے ہیں۔ ان کے اندر یہ صلاحیت باقی نہیں رہی ہے کہ وہ ''شکر'' کو ''انرجی'' میں تبدیل کر سکیں۔ وہ بے طاقت کو اپنے لیے طاقت بنا لیں۔

سماجی زندگی میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے ساتھ ناخوش گوار تجربات پیش آتے ہیں۔ ایک شخص کو دوسرے شخص سے کوئی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی کا مفاد دوسرے کے مفاد سے ٹکرا جاتا ہے۔ ایک شخص ایسے الفاظ بولتا ہے جس کو سُن کر دوسرا شخص محسوس کرتا ہے کہ وہ اس کی ذاتی یا قومی حیثیت پر چوٹ کر رہا ہے۔ اس قسم کے واقعات سماجی زندگی میں لازماً پیش آتے ہیں اور پیش آتے رہیں گے۔ ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم ایسے واقعات کی پیدائش کو روک دیں۔ ہمارے لیے جو چیز ممکن ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم ایسے واقعات سے منفی اثر نہ لیں۔

ایک تندرست آدمی اپنے اندر داخل ہونے والی شکر کو انرجی میں تبدیل کرتا ہے۔ یہی تبدیلی کا عمل نفسیاتی طور پر بھی مطلوب ہے۔ اس دنیا میں بہتر سماجی زندگی بنانے کا راز صرف یہ ہے کہ لوگوں کو شعوری اعتبار سے اس قابل بنایا جائے کہ وہ ناخوشگوار واقعہ کو خوشگوار تاثیر میں تبدیل

کرسکیں۔وہ غصہ کے جواب میں معافی پیش کریں اور برائی کرنے والوں کو اچھے سلوک کا تحفہ دیں۔

موجودہ سماج کے افراد نفسیاتی اعتبار سے ڈائبٹک ہوگیے ہیں۔ان کی اس نفسیاتی بیماری کا علاج کیجئے، اور پھر آپ دیکھیں گے کہ جو سماج باہمی اختلافات کا گھوارہ بنا ہوا تھا وہ متنوع قسم کے پودوں اور درختوں کا خوشنما باغ بن گیا ہے۔

تبدیلی کا اصول

کائناتی پیٹرن کا ایک پہلو یہ ہے کہ یہاں کا پورا نظام تبدیلی (Conversion) کے اصول پر قائم ہے۔ یہاں کسی چیز کی افادیت کا معیار یہ ہے کہ وہ کنورژن کے اصول پر پوری اترے۔ مثلاً اس دنیا میں انسان کی سانس سے اور دوسرے اسباب سے بڑی مقدار میں کاربن ڈائی آکسائڈ گیس پیدا ہوتی ہے۔ درخت اس کو اپنے اندر لے لیتے ہیں۔ درخت کے اندر جو کاربن ڈائی آکسائڈ داخل ہوتی ہے۔اگر وہ دوبارہ اس کو کاربن ڈائی آکسائڈ ہی کی صورت میں نکالیں تو پوری فضا زہریلی ہوجائے اور انسان اور حیوانات کے لیے اس دنیا میں زندہ رہنا ناممکن ہوجائے۔مگر درخت اس کاربن ڈائی آکسائڈ کو مخصوص عمل کے ذریعہ آکسیجن میں تبدیل کرتے ہیں اور اس کو آکسیجن کی صورت میں خارج کرتے ہیں۔وہ دوسروں سے زہریلی گیس لے کر دوسروں کو مفید گیس کا تحفہ پیش کرتے ہیں۔

اسی طرح مثلاً گائے کو دیکھئے۔گائے گویا قدرت کی انڈسٹری ہے جو گھاس کھاتی ہے اور اس کو دودھ کی صورت میں ہمیں لوٹاتی ہے۔ وہ انسان کے لیے ناقابل خوراک چیز کو قابل خوراک چیز میں کنورٹ کرنے کا قدرتی کارخانہ ہے۔گائے اگر ایسا کرے کہ وہ گھاس کھا کر گھاس خارج کرنے لگے تو وہ اپنی قیمت اور افادیت کھودے گی۔

کنورژن (تبدیلی) کا یہ اصول جو بقیہ دنیا میں قائم ہے، وہی انسان سے بھی مطلوب ہے بقیہ دنیا کی صحیح کارکردگی کا راز یہ ہے کہ وہ کنورژن کے اصول پر کام کررہی ہو۔اسی طرح بہتر زندگی اور کامیاب انسانی سماج بنانے کا راز بھی یہی ہے کہ اس کے افراد اس صلاحیت کا ثبوت دے سکیں کہ وہ ''گھاس'' پائیں اور اس کو ''دودھ'' کی صورت میں دنیا والوں کی طرف لوٹا سکیں۔

قرآن میں سچے انسانوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ جب انھیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف کردیتے ہیں یعنی دوسروں کی طرف سے انھیں ایسے سلوک کا تجربہ ہوتا ہے جو ان کے اندر غصہ اور انتقام کی آگ بھڑکانے والا ہو، مگر وہ غصہ اور انتقام کی آگ کو اپنے اندر ہی اندر بجھا دیتے ہیں اور دوسرے شخص کو جو چیز لوٹاتے ہیں وہ معافی اور درگذر کا سلوک ہوتا ہے نہ کہ غصہ اور انتقام کا سلوک۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ بھلائی اور برائی دونوں یکساں نہیں۔تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی قریبی دوست (حم السجدہ 34) اس آیت کے بارہ میں حضرت علی بن ابی طالبؓ نے فرمایا:

امر الله المومنين بالصبر عند الغضب و الحلم عند الجهل و العفو عند الإساءة فاذا فعلوا ذالك عصمهم الله من الشيطان و خضع لهم عدوهم كانه ولى حميم۔

اللہ نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ وہ غصہ کے وقت صبر کریں۔کوئی جہالت کرے تو اس کو برداشت کریں۔ برائی کی جائے تو معافی اور درگذر کا طریقہ اختیار کریں جب وہ ایسا کریں گے تو اللہ ان کو شیطان سے بچائے گا اور ان کے دشمن کو اس طرح جھکا دے گا کہ وہ ان کا قریبی دوست بن جائے۔

یہ وہی صفت ہے جس کو اوپر ہم نے کنورژن سے تعبیر کیا ہے۔ خدا پرست آدمی کی خدا پرستی اس کے اندر ایسی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ بُرائی کو بھلائی میں تبدیل کر سکے۔ جو لوگ اسے گالی دیں، ان کے لیے وہ دعا کرے۔ جو لوگ اس کے ساتھ غیر انسانی سلوک کریں ان کے ساتھ وہ انسانی سلوک کا طریقہ اختیار کرے۔ جو لوگ اس سے کڑوا بول بولیں، ان کا استقبال وہ میٹھے بول سے کرے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہتر سماج کی تعمیر کے لیے ہماری کوششوں کا رُخ کیا ہونا چاہیے وہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم افراد کے اندر ''کنورژن'' کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

موجودہ دنیا میں صالح سماج اسی کنورژن کے ذریعہ بنایا جا سکتا ہے، اس کے سوا صالح سماج بنانے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔

ایک مثال

سچے انسان کو لوگوں کے درمیان کس طرح رہنا چاہیے، اس کی بہترین میکینیکل مثال شاک ابزاربر (Shock absorber) کی ہے۔ شاک ابزاربر کے لفظی معنی ہیں جھٹکے کو سہنے والا یہ ایک آلہ ہے جو کہ موٹر گاڑیوں میں لگایا جاتا ہے اور ایکسل اور باڈی کے درمیان ایک قسم کے گدے کا کام کرتا ہے۔ وہ سڑک کی سطح کے تموج سے پیش آنے والے جھٹکوں کو باڈی تک پہنچنے سے روکتا ہے:

A device which on a automobile, acts as a cushion between the axles and the body and reduces the shocks on the body produced by undulations of the road surface (IX/159).

اگر ایک ٹریکٹر پر 50 کیلومیٹر کا سفر کریں تو آپ اپنی منزل پر اس طرح پہنچیں گے کہ آپ تھکے ہوئے ہوں گے۔ اس کے برعکس جب آپ ایک اچھی موٹر کار پر 50 کیلومیٹر کا سفر کریں تو آپ منزل پر اس طرح اترتے ہیں کہ آپ بالکل تازہ دم ہوتے ہیں۔

دونوں گاڑیوں میں اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب شاک ابزاربر ہے۔ کار جب چلتی ہے تو زیادہ تر اس کا پہیہ نیچے اوپر ہوتا ہے، باڈی نیچے اوپر نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس جب ٹریکٹر چلتا ہے تو اس کا پہیہ اور باڈی دونوں نیچے اوپر ہوتے رہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، کار اس گاڑی کا نام ہے کہ جو جھٹکا گاڑی کو لگا وہ گاڑی تک رہ گیا، وہ مسافر تک نہیں پہنچا۔ اس کے برعکس ٹریکٹر اس گاڑی کا نام ہے کہ جو جھٹکا گاڑی کو لگا وہ گاڑی تک نہیں رُکا، بلکہ وہ مسافر تک پہنچ گیا۔

سچا انسان دنیا میں کار کی طرح جیتا ہے، اور جھوٹا انسان ٹریکٹر کی طرح۔ سچے انسان کے سینے میں ایک ''شاک ابزاربر'' ہوتا ہے جو تمام جھٹکوں اور صدموں کو اندر ہی اندر سہتا رہتا ہے۔

اس کے برعکس جھوٹے انسان کے اندر ''شاک ابزاربر'' نہیں ہوتا۔ وہ ہر جھٹکے کو دوسروں تک پہنچاتا رہتا ہے۔ اچھا سماج بنانا ہے تو سچے انسان بنائیے۔ کیوں کہ یہ دراصل جھوٹے انسان ہی ہیں جو سماج کو بگاڑ اور فساد سے بھر دیتے ہیں۔

یک طرفہ طریقہ

دہلی کے ایک انگریزی اخبار میں میں نے ایک آرٹیکل پڑھا۔ اس کا عنوان تھا دوطرفہ طریقہ بہترین طریقہ ہے (Bilateralism is best) یعنی دو فریقوں کے درمیان نزاع ہو تو اس کو حل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں ''ففٹی ففٹی'' پر راضی ہو جائیں۔ پچاس فیصد ذمہ داری ایک فریق لے اور پچاس فی صد ذمہ داری دوسرا فریق لے۔ اور اس طرح معاملہ ختم کر دیا جائے۔

یہ بات گرامر کے لحاظ سے صحیح مگر حقیقت کے اعتبار سے غلط ہے۔ کیوں کہ وہ موجودہ دنیا میں ناقابل عمل ہے۔ اس دنیا میں کوئی نزاع اسی وقت ختم ہو سکتی ہے جب کہ ایک فریق یک طرفہ طور پر اس کو ختم کرنے پر راضی ہو جائے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ یک طرفہ طریقہ بہترین طریقہ ہے:

Unilateralism is Best

پیغمبر اسلامؐ نے جھگڑوں اور شکایتوں کو ختم کرنے کا یہی طریقہ بتایا ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ: (جو شخص تمہارے ساتھ برا سلوک کرے، اس کے ساتھ تم اچھا سلوک کرو) یعنی ردعمل کا طریقہ اختیار نہ کرو۔ اور نہ اس کا انتظار کرو کہ دوسرا فریق پچاس فیصد جھکے تو تم بھی پچاس فی صد جھک جاو۔ اس کے برعکس خدا پرست انسان کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ یک طرفہ حسن سلوک کا طریقہ اختیار کرے۔ اسی یک طرفہ حسن اخلاق کا دوسرا نام صبر ہے۔ اور اسی صبر میں بہتر انسانی سماج کا راز چھپا ہوا ہے۔

اصلاح کی طرف

پروفیسر ہیرن مکر جی ایک فریڈم فائٹر ہیں۔ وہ جواہر لال نہرو (1964-1889) کے زمانہ میں ہندستانی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ پروفیسر ہیرن مکر جی ایک بار پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کے لیے دہلی آئے۔ اجلاس سے فارغ ہو کر جب وہ دہلی سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے تو ان پر ایک تجربہ گزرا۔ کلکتہ واپس پہنچ کر انھوں نے سابق وزیر اعظم ہند، جواہر لال نہرو کے نام ایک خط لکھا جس میں اس تجربہ کا ذکر تھا۔

پروفیسر مکر جی نے لکھا کہ میری ٹرین جب نئی دہلی کے ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ریلوے لائن کے کنارے بہت دور تک جھگی جھوپڑی کی قطاریں چلی جارہی ہیں۔ ان کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ان جھوپڑیوں میں رہنے والے غریب ہندستانی اگر مجھ سے پوچھیں کہ ملک کی آزادی سے ہم کو کیا ملا تو میں ان کو کیا جواب دوں گا۔ جواہر لال نہرو نے اس کے جواب میں پروفیسر مکر جی کو جو خط لکھا اس کا ایک جملہ یہ تھا:

You are paying the price of being sensitive.

(تم اپنے حساس ہونے کی قیمت ادا کر رہے ہو) راقم الحروف کو یہ پسند نہیں کہ ہم حساس نہ ہوں۔ بلکہ میں چاہتا ہوں کہ ہم حساس ہوں تا کہ ہم تڑپیں۔ تا کہ ہم ملک کے حالات کے بارہ میں زیادہ سنجیدہ ہوں، تا کہ ہم اس کے متعلق زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچیں اور ملک کو بہتر مستقبل کی طرف لے جانے کی فکر کریں۔

آپ جانتے ہیں کہ نئے ہندستان کا آغاز 1947 سے ہوتا ہے۔ اس سے پہلے یہ ملک یورپی قوموں کے سیاسی اور اقتصادی استحصال کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ مہاتما گاندھی (1947-1869) نے ہندستان کو سیاسی بنیاد (Political base) عطا کی۔ اس کے بعد جواہر لال نہرو (1964-1889) نئے ہندستان کے وزیر اعظم ہوئے اور انھوں نے ملک کے لیے صنعتی بنیاد (Industrial base) فراہم کی۔

اس سے پہلے ہندستان کی جو حالت تھی اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حکومتی فیصلہ کی قوت ملکی باشندوں کے ہاتھ میں نہ ہونے کی وجہ سے سڑکوں کی ترقی کا کام بہت دیر سے شروع ہو سکا ہندستان میں ریلوے کا آغاز برٹش دور میں 1853 میں ہوا۔ اور بہت جلد سارے ملک میں ریلوے لائن کا جال بچھا دیا گیا۔ مگر سڑکوں کی ترقی 70 سال تک رکی رہی۔ ملک میں سڑکوں کی تعمیر حکومت کی توجہ کا مرکز نہ بن سکی۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں:

Little attention was paid to road development until the 1920s, mainly because the government had previously focussed its attention on railways (9/295).

1920 کے بعد کے سالوں سے پہلے روڈ کی ترقی پر بہت کم توجہ دی جا سکی۔ خاص طور پر اس وجہ سے کہ (برطانی) حکومت نے اس سے پہلے اپنی ساری توجہ ریلوے پر لگا رکھی تھی۔

برطانی حکومت ریل کی پٹریوں کو لوہے کی زنجیریں سمجھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ان زنجیروں کے ذریعہ وہ ملک پر اپنے قبضہ کو زیادہ دیر تک باقی رکھ سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ریلوے لائنیں بچھانے پر خصوصی توجہ دی۔ مگر سڑکیں بنانے پر وہ توجہ نہ دے سکی۔ ملک کو سیاسی غلامی کی یہ قیمت دینی پڑی کہ سڑکوں کی تعمیر کے معاملہ میں وہ پیچھے ہو گیا جو کہ قومی ترقی کے لیے موجودہ زمانہ میں نہایت اہمیت رکھتی ہیں۔

دوسری مثال صنعت کی ہے۔ ہندستان میں اکثر معدنی ذخیرے (Mineral resources) افراط کے ساتھ موجود ہیں۔ یہاں صنعتی ایندھن (کوئلہ) بھی بڑی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ دنیا کے لوہے (Iron-ore) کے ذخائر کا 1/7 حصہ صرف ہندستان کی زمین کے نیچے موجود ہے۔ اس کے باوجود ملک کی آزادی سے پہلے اس کی صنعتی ترقی ممکن نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سے پہلے یہاں ایک بیرونی قوم کا قبضہ تھا۔ وہ ہندستان کو اپنی صنعتی سامانوں کی منڈی بنائے ہوئے تھے۔ 1947 میں جب ہندستان آزاد ہوا تو اس کے بعد یہاں باہر کا سامان درآمدہ کرنے پر پابندیاں لگائی گئیں۔ اور ملکی صنعت کو ترقی کے مواقع دیئے گیے۔ چنانچہ ہندستان تیزی سے صنعتی میدان میں آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ اب وہ صنعتی طور پر ترقی یافتہ

ملکوں میں شمار کیا جانے لگا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سیاسی اور صنعتی اعتبار سے ملک اب ترقی کے اگلے اسٹیج پر پہنچ رہا ہے۔ ہندستان کی سیاسی بنیاد اب اتنی مضبوط ہو چکی ہے کہ وہ ''تیسری دنیا'' کے ملکوں کی قیادت کرنے کی پوزیشن میں ہے۔ اسی طرح ہندستان کی صنعتی بنیاد اب اتنی گہری ہو چکی ہے کہ 1985 سے اس نے الکٹرانک دور میں داخلہ کا آغاز کر دیا ہے۔ پہلے ہندستان کو یہ ڈر رہتا تھا کہ امپورٹ کا راستہ کھولنے سے اس کی اندرونی صنعت برباد ہو جائے گی۔ اور اب ملک کو اس حد تک اعتماد پیدا ہو چکا ہے کہ وہ امپورٹ کی پابندیاں کم کرنے کے بعد بھی یہ اعتماد رکھتا ہے کہ وہ بیرونی صنعتوں کا مقابلہ کر کے آگے بڑھ سکتا ہے۔

یہ باتیں بلاشبہ اچھی ہیں۔ یہ ہر ہندستانی کے لیے خوشی کا باعث ہیں کہ پچھلے 40 سال میں ملک نے سیاسی اور صنعتی بنیاد حاصل کر لی۔ مگر ہندستان کی حقیقی ترقی کے لیے ابھی ایک اور مشکل تر مرحلہ باقی ہے۔ اور وہ یہ کہ ملک کو اخلاقی بنیاد (Moral base) عطا کی جائے۔ اخلاقی بنیاد فراہم کرنے کا مسئلہ فیصلہ کن حد تک اہم ہے۔ اگر یہ بنیاد فراہم نہ ہو تو بقیہ میدانوں کی ترقیاں بھی غیر موثر ہو کر رہ جائیں گی۔

یہاں ہم سابق وزیر اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک اقتباس نقل کریں گے۔ انھوں نے اپنے سوانح نگار مائیکل بریچر کو انٹرویو دیتے ہوئے 1956 میں کہا تھا:

> What constitutes a good society ? I believe in certain standards. Call them moral standards. They are important in any individual and in any social group. And If they fade away, I think that all the material advancement you may have will lead to nothing worthwhile. How to maintain them, I can't know.
>
> Nehru, A Political Biography, By Michael Brecher, p.607

وہ کیا چیز ہے جو ایک اچھا سماج بناتی ہے۔ میں کچھ متعین معیاروں میں عقیدہ رکھتا ہوں۔ آپ ان کو اخلاقی معیار کہہ سکتے ہیں۔ وہ ہر شخص اور ہر سماجی گروہ کے لیے اہم ہیں۔ اور اگر وہ باقی نہ رہیں تو میرا خیال ہے کہ آپ نے جو بھی مادی ترقی حاصل کی ہو وہ بے قیمت ہو کر رہ جائے

گی۔اس اخلاقی معیار کو کس طرح حاصل کیا جائے، اس کا جواب مجھے نہیں معلوم۔

ہندستان کے موجودہ وزیر اعظم کی ایک تقریر اخبارات میں حسب ذیل الفاظ میں آئی ہے:

Prime Minister Rajiv Gandhi today said building factories and dams was useless if the quality of human beings was not good.
The Hindustan Times, September 12. 1986

وزیر اعظم راجیو گاندھی نے کہا کہ کارخانے اور بند بنانا بے فائدہ ہے اگر انسانوں کے اندر اچھی خصوصیات نہ ہوں۔

مثلاً ملک میں بجلی اور زراعت کی ترقی کے لیے ہمیں ایک ڈیم بنانا ہے۔ اب ایک ضرورت یہ ہے کہ ملک آزاد ہوتا کہ وہ کسی خارجی دباو کے بغیر خود اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کر سکے۔ یہ ضرورت ملک کی سیاسی آزادی سے پوری ہو جائے گی۔ دوسری ضرورت یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کی تعمیر کے لیے ضروری ٹکنالوجی موجود ہو۔ یہ ضرورت ہمارے وہ ٹکنکل ماہرین پوری کر دیں گے جو انجینئرنگ کالجوں سے ڈگری لے کر نکل رہے ہیں۔

مگر اچھے ڈیم کی تیاری کے لیے صرف یہی دو چیزیں کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ ایک تیسری چیز بھی ہے جو لازمی طور پر ضروری ہے، اور وہ ہے دیانت داری (Honesty) اگر کام کرنے والے افراد کے اندر دیانتداری کا مادہ نہ ہو تو سیاسی آزادی اور ٹکنکل قابلیت کے باوجود وہ ڈیم تیار نہ ہو سکے گا جو فی الواقع ملک کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔

دیانت داری نہ ہونے کی صورت میں یہ ہوگا کہ حکومت عوام سے ٹیکس وصول کر کے ایک ارب روپیہ ٹھیکہ داروں اور انجینئروں اور افسروں کے ہاتھ میں دے گی۔ مگر وہ روپیہ کا ایک حصہ اپنی جیب میں رکھنے کی خاطر یہ کریں گے کہ وہ غیر معیاری لوہا استعمال کریں گے۔ وہ ریت اور سمنٹ کا تناسب غلط کر دیں۔ وہ پیسہ بچانے کے لیے ہر چیز میں کمی کرتے رہیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بظاہر ڈیم تو بن کر تیار ہو جائے گا۔ مگر لوہے اور سمنٹ (RCC) کی تعمیر کے باوجود وہ مضبوط نہ ہوگا۔ بے پناہ خرچ اور سالوں کی منصوبہ بندی کے بعد اُدھر ڈیم بن کر کھڑا ہوگا اور اِدھر خبریں آنے لگیں گی کہ اس کا فلاں حصہ ٹوٹ گیا ہے۔ اس کے فلاں حصہ میں شگاف ہو گیا ہے۔

بے پناہ خرچ کے بعد ایک پُل بن کر کھڑا ہوگا اور اگلے سال خبر ملے گی کہ وہ ٹوٹ کر گر پڑا۔

اس مہلک انجام سے بچنے کی صورت صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ملک میں جس طرح سیاسی انقلاب اور صنعتی انقلاب برپا کیا گیا ہے، اسی طرح ملک میں ایک اخلاقی انقلاب برپا کیا جائے۔ ملک کو جس طرح سیاسی بنیاد اور صنعتی بنیاد فراہم کی گئی ہے اسی طرح اس کے لیے اخلاقی بنیاد بھی فراہم کی جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ اخلاقی بنیاد کیا ہے اور اس کو ہم کس طرح ملک کے حق میں تعمیر کر سکتے ہیں۔

اخلاقیات (یا مارل فلاسفی) پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اب وہ ایک پیچیدہ فن بن گیا ہے مگر اس کی فنی تفصیلات اور اخلاقی فلاسفہ کے اختلافات سے قطع نظر، یہاں میں صرف اس کے سادہ عملی پہلو کو بیان کروں گا۔ جو کہ اخلاق کے معاملہ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

اخلاق کا خلاصہ انسانیت کا احترام ہے۔ دوسرے افراد یا گردوپیش کے انسانی معاشرہ کی نسبت سے آدمی کے اوپر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، خواہ باضابطہ طور پر ان کے بارہ میں قول وقرار ہوا ہو، یا باضابطہ قول وقرار نہ ہوا ہو، ہر حال میں ان کو ادا کرنا ضروری ہے اور اسی ادائیگی کا نام اخلاق ہے۔

اس تعریف کے مطابق اخلاق ہر آدمی کی جانی پہچانی اور معلوم چیز ہے۔ ہر آدمی فطری طور پر حق اور ناحق کی پہچان رکھتا ہے۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ دوسروں سے معاملہ کرتے ہوئے اس کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ اخلاق یہ ہے کہ آدمی اپنی اسی جانی ہوئی چیز پر عمل کرنے لگے۔

اسی بنا پر اخلاقیات کے لیے قرآن وحدیث میں معروف اور منکر کے الفاظ استعمال کیے گیے ہیں۔ اسلام کی نظر میں پسندیدہ اخلاق ''معروف'' ہے اور ناپسندیدہ اخلاق ''منکر''۔ معروف کے معنی ہیں جانی پہچانی چیز، اور منکر کے معنی ہیں اجنبی چیز۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو اچھا قرار دیا ہے وہ وہی چیزیں ہیں جن کے اچھا ہونے کا شعور خود انسانی فطرت میں پیوست ہے۔ اسی طرح جن چیزوں کو الٰہی شریعت میں برا قرار دیا گیا ہے وہ وہی چیزیں ہیں جن کو انسانی

فطرت پیشگی طور پر برا سمجھتی ہے۔

تاہم معروف ومنکر کے یہ احساسات انسانی فطرت میں وجدانی طور پر پیوست ہیں نہ کہ اس طرح لکھے ہوئے ہیں جس طرح کاغذ کے صفحہ پر کوئی چیز لکھی جاتی ہے۔ الٰہی شریعت یہاں یہ کرتی ہے کہ وہ معروف ومنکر کے احساسات کو الفاظ کی شکل دے دیتی ہے۔ وہ محسوس چیز کو ملفوظ چیز بنا دیتی ہے۔

حدیث میں اخلاق کی نہایت سادہ پہچان بتائی گئی ہے۔ وہ یہ کہ تم دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرو جو سلوک تم خود اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ ہر آدمی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ دوسروں کو اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیے، بس اسی کو وہ خود بھی دوسروں کے ساتھ کرنے لگے۔ جس آدمی کے اندر یہ صفت آ جائے وہ با اخلاق آدمی ہو گیا۔ اخلاق، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اس کے سوا کسی اور چیز کا نام نہیں کہ جو کچھ ہم اپنے لیے پسند کرتے ہیں وہی ہم دوسروں کے لیے بھی پسند کرنے لگیں۔

اخلاق کے اس قدم معلوم اور معروف ہونے کے باوجود اخلاق ہی وہ چیز ہے جو لوگوں میں سب سے کم پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاق کی ایک قیمت ہے اور اسی قیمت نے اس کے خریداروں کو اس سے دور کر رکھا ہے۔ لوگ جو کچھ صحیح سمجھتے ہیں اس کو کرتے نہیں، کیوں کہ وہ اس کی قیمت دینا نہیں چاہتے۔

اخلاق کی قیمت کیا ہے، ایک لفظ میں اخلاق کی قیمت ہے۔۔۔۔۔ قیمت نہ ملنے کے باوجود اخلاق برتنا۔ عام آدمی ہمیشہ مفاد کے تحت عمل کرتا ہے۔ یعنی جہاں ایک عمل کر کے کچھ بدلہ ملے وہاں وہ عمل کرے گا اور جہاں عمل کا بدلہ ملنے کی امید نہ ہو وہاں وہ عمل بھی نہیں کرے گا ۔جس سماج میں اس مزاج کے لوگ ہوں وہاں کبھی صحیح معنوں میں اخلاقی ماحول نہیں بن سکتا۔ کیوں کہ زندگی میں ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ آدمی ایک اچھا سلوک کرے تو فوراً اس کو اپنے اچھے سلوک کا بدلہ مل جائے۔ دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو بدلہ کی امید کے بغیر اچھا سلوک کرنا جانیں۔ جو لوگ اپنے عمل کا فوراً بدلہ پانا چاہیں وہ کبھی اعلیٰ کردار کے

مالک نہیں بنتے، اور اسی لیے وہ اس دنیا میں کوئی بڑا کام بھی نہیں کرسکتے۔

اخلاقی بنیاد فراہم کرنا دوسرے لفظوں میں اس کا نام ہے کہ لوگوں کو کوئی اتنی بڑی چیز دی جاسکے جس کے بعد ہر چیز ان کی نظر میں چھوٹی ہو جائے۔ دوسروں کے ساتھ اخلاق برتنے کے لیے آدمی کو کچھ کھونا پڑتا ہے۔ آدمی کو اگر کوئی اتنی بڑی چیز مل جائے کہ اس کے مقابلہ میں ہر دوسری چیز چھوٹی نظر آئے تو اس کے لیے اخلاق پر قائم رہنا آسان ہو جائے گا۔ آدمی کو اس قابل بنائیے کہ وہ کھونے کو برداشت کرسکے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ بااخلاق ہو جائے گا۔

ایک مغربی ملک کا واقعہ ہے۔ ایک کسٹم افسر نے ایک شخص کو پکڑا جو ایک خلاف قانون چیز ملک کے اندر لے جانا چاہتا تھا۔ آدمی نے کسٹم افسر سے کہا کہ پانچ ہزار ڈالر لے لو اور مجھ کو چھوڑ دو۔ کسٹم افسر بگڑ گیا۔ اس نے کہا کہ دس ہزار ڈالر لے لو۔ کسٹم افسر اور زیادہ بگڑ گیا آدمی مزید قیمت بڑھاتا گیا۔ 20 ہزار ڈالر، 25 ہزار ڈالر، 30 ہزار ڈالر، پچاس ہزار ڈالر۔ یہاں تک کہ اس نے کہا کہ 80 ہزار ڈالر لے لو۔ اور چھوڑ دو۔ آدمی نے جب ''80 ہزار ڈالر'' کہا تو کسٹم افسر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ایک لمحہ وہ رکا اور اس کے بعد چیخ کر بولا:

ظالمو، تم میری قیمت کے قریب پہنچ گیے ہو

80 ہزار ڈالر کا لفظ سن کر کسٹم افسر کے اندر ایک نیا خیال پیدا ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ سالہا سال تک سروس کرنے کے بعد بھی میں 80 ہزار ڈالر بچا نہیں سکوں گا۔ اور یہ شخص مجھے ایک منٹ کے اندر 80 ہزار ڈالر دے رہا ہے۔ پھر میں کیوں نہ اس کو قبول کرلوں۔ پانچ ہزار ڈالر اور دس ہزار ڈالر نے اس کو اندر سے نہیں ہلایا تھا۔ مگر 80 ہزار ڈالر کی پیش کش نے اس کو اندر سے ہلا دیا۔ اس کے اندر جو اخلاقی بنیاد موجود تھی وہ متزلزل ہو کر رہ گئی۔

یہی ہر آدمی کا حال ہے۔ ہر آدمی کی قیمت کہیں نہ کہیں لگ جاتی ہے۔ اور جہاں آدمی کی قیمت لگ جائے بس وہیں اس کے اندر اخلاقی بنیاد ختم ہو جاتی ہے۔ وہ اصول کے بجائے مفاد کا بندہ بن کر رہ جاتا ہے۔

کچھ لوگ ہیں جو سماجی پوزیشن کی خاطر بااخلاق ہوتے ہیں۔ وہ اپنے عام رویہ اور روزمرہ

کی ملاقات میں بظاہر اچھے بنے رہتے ہیں تا کہ لوگ انھیں اچھا سمجھیں مگر یہ اخلاق کے لیے بہت کمزور بنیاد ہے۔ ایسے لوگوں کا اخلاق نہایت وقتی اخلاق ہوتا ہے۔ جیسے ہی کوئی ذاتی انٹرسٹ کا موقع پیدا ہوتا ہے۔ان کی حد آجاتی ہے۔وہ ذاتی فائدہ حاصل کرنے کی خاطر اخلاقی اصول کو بھول جاتے ہیں۔

ایک شخص سرکاری دفتر میں کلیدی عہدہ (Key post) پر تھا۔اس کے یہاں ایک صاحب کی فائل تھی۔ان کا کیس بالکل جائز کیس تھا مگر وہ ان کو پریشان کررہا تھا تا کہ وہ اس کو ایک بڑی رقم رشوت میں دیں۔ یہ صاحب اپنے جاننے والے ایک شخص سے ملے جن کے متعلق ان کو پتہ تھا کہ وہ مذکورہ سرکاری ملازم کے دوست ہیں۔ان سے اپنی مصیبت بیان کی۔انھوں نے کہا کہ بہت اچھا میں اس سے ملوں گا۔

یہ صاحب ایک روز مذکورہ سرکاری ملازم کے یہاں گیے۔ملازم خندہ پیشانی سے ملا۔اس نے چائے اور سگریٹ پیش کیا۔مگر جب آنے والے نے اس سے اپنی ضرورت بیان کی تو فوراً اس کا چہرہ بدل گیا۔طرح طرح کی قانونی موشگافیاں بتا کر اس نے عذر کر دیا۔وہ مذکورہ شخص کو جان بوجھ کر صرف اس لیے پریشان کررہا تھا کہ وہ اس کو ایک بڑی رقم رشوت کے طور پر دے۔ ایسی حالت میں رقم لیے بغیر وہ فائل کیسے واپس کر دیتا۔

مذکورہ سرکاری افسر ابتداءً بااخلاق تھا۔مگر جب فائل کا مسئلہ طے کرنے کی بات آئی تو اس کے اخلاق کی حد آگئی۔وہ صرف اس وقت تک بااخلاق تھا جب تک اس کے ذاتی مفاد پر زد نہ پڑ رہی ہو۔جب ذاتی مفاد خطرے میں آجائے تو پھر اس کے نزدیک اخلاق کی کوئی قیمت نہ تھی۔

مغربی ملکوں میں بظاہر اس قسم کی بداخلاقی نہیں ہے۔ وہاں دفتروں میں بغیر رشوت کے کام ہوتا ہے۔عام طور پر لوگ اپنی ڈیوٹی صحیح طور پر انجام دیتے ہیں۔پولیس کا آدمی کسی کو ناجائز کام کرتے ہوئے پکڑ لے تو اس آدمی کو معلوم ہے کہ وہ پولس والوں کی جیب میں نوٹ ڈال کر ان کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔روزمرہ کی زندگی میں جو بدعنوانیاں (Coruption) ہمارے ملک میں نظر آتی ہیں وہ مغربی ملکوں میں عام طور پر دکھائی نہیں دیتیں۔

تاہم یہ اخلاق قومی مفاد کی بنیاد پر بنا ہے اس لیے اس کی بھی حد آجاتی ہے۔ مثلاً مغربی ملکوں میں ایسا نہیں ہوتا کہ دودھ میں پانی ملایا جائے۔ نقلی سامان تیار کر کے بازار بھر دیئے جائیں۔ ایک تاجر نمونہ کے طور پر اچھا مال دکھائے اور اس کے بعد خراب مال پیک کر کے آپ کو بھیج دے۔ دفتروں میں اپنا جائز کام بھی رشوت کے بغیر نہ ہو سکے۔

مگر مغربی انسان کے اس اخلاق کی اس وقت حد آجاتی ہے جب کہ اس کا اخلاق قومی مفاد سے ٹکرانے لگے۔ مثلاً موجودہ زمانہ میں بڑے بڑے ترقی یافتہ ملکوں کے یہاں سب سے زیادہ جس صنعت کو ترقی ہوئی ہے وہ جنگی صنعت ہے۔ ان ملکوں کے پاس تیار شدہ جنگی سامان کے انبار جمع ہو گیے ہیں۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں انتہائی مہلک ہیں۔ وہ خدا کی دنیا کو جہنم بنا دینے والی ہیں۔ مگر ان کا قومی مفاد چاہتا ہے کہ وہ فروخت ہوں تا کہ ان پر جو بے پناہ لاگت آئی ہے وہ نفع کے ساتھ انھیں واپس ملے۔

اگر حالات بالکل معمول پر ہوں۔ ہر طرف امن وسکون ہو تو کوئی بھی ان کے مہلک ہتھیاروں کو نہیں خریدے گا۔ اس لیے یہ ترقی یافتہ قومیں یہ کرتی ہیں کہ عالمی سطح پر تناو کے حالات پیدا کرتی ہیں۔ ان کے رہنما اپنے تخریبی منصوبوں کے ذریعہ ایک ملک کو دوسرے ملک سے لڑاتے ہیں۔ وہ ہر علاقہ میں زبردستی ایک ''اسرائیل'' کھڑا کرتے ہیں تا کہ قوموں کے اندر خطرہ کی نفسیاتی پیدا ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ ان کے ہتھیار خریدیں۔

اپنے معاشرہ میں ذاتی سلوک کے معاملہ میں ان قوموں کے افراد با اخلاق ہیں۔ مگر جب ان کی قوم کے مفاد کا معاملہ آجائے تو وہاں ان کی حد آجاتی ہے۔ قومی مفاد کے معاملہ میں وہ ان سب چیزوں کو جائز کر لیتے ہیں جن کو وہ ذاتی مفاد کے معاملہ میں ناجائز کیے ہوئے تھے۔

ہر آدمی کی زندگی میں کوئی ایسی چیز ہوتی ہے جو اس کے لیے سب سے بڑی (Supreme) حیثیت رکھتی ہے۔ عام آدمی کے لیے اس کا ذاتی مفاد اس کے لیے سپریم ہوتا ہے۔ کچھ ترقی یافتہ معاشروں میں ان کا قومی مفاد ان کے لیے سپریم ہے۔ مگر ان دونوں میں سے کوئی بھی چیز اخلاق کی صحیح بنیاد نہیں۔ کیوں کہ ذاتی مفاد کی بنیاد پر بننے والے اخلاق کی اس وقت حد آجائے گی جب

کہ اس کا مفاد دوسرے کے مفاد سے ٹکرا رہا ہو۔ اسی طرح قومی مفاد کی بنیاد پر بننے والے اخلاق کی اس وقت حد آجاتی ہے جب کہ اپنی قوم کا مفاد اور دوسری قوم کا مفاد یکساں نہ رہے۔ اپنا قومی مفاد اگر اس میں ہو کہ لوگ جنگی سامان خرید کر قتل وغارت کا میدان گرم کریں تو وہ جنگی سامان بنائے گا اور اس کو دوسری قوموں کے ہاتھ فروخت کرے گا۔ خواہ اس کی قومی تجارت کا فروغ دوسری قوموں کی ہلاکت کی قیمت پر کیوں نہ ہو رہا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کی ایک ہی صحیح بنیاد ہے اور وہ خدائے برتر کا عقیدہ ہے جو تمام کائنات کا خالق ومالک ہے۔ خدا تمام دوسری چیزوں سے بڑا ہے۔ وہ سب سے زیادہ سپریم ہے۔ جو شخص خدا کو پالے اس نے سب سے بڑی چیز کو پالیا۔ ایسے آدمی کی کبھی حد نہیں آئے گی۔ اس کی نظر میں ہر دوسری چیز چھوٹی ہوگی۔ خدا کو پا کر وہ آخری سب سے بڑی چیز کو پالے گا۔ اس کے بعد ہر دوسری چیز کی قربانی اس کے لیے آسان ہو جائے گی ۔ وہ ہر دوسری چیز کا کھونا برداشت کرلے گا۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوگا کہ کھونے کے بعد بھی اس کے پاس ایک چیز موجود ہے جو تمام چیزوں سے زیادہ بڑی ہے اور وہ اس کا خدا ہے۔

ایک ملحد کا اعتراف

برٹرینڈ رسل خدا کو نہیں مانتا۔ وہ انسانی معاملات کی تنظیم کے لیے انسانی قانون کو کافی سمجھتا ہے۔ مگر اسے یقین نہیں کہ ایسا ممکن ہے۔ وہ اس وقت اپنے کو لاجواب محسوس کرتا ہے کہ جب کہ ایک خدا پرست آدمی اس سے کہے کہ میں انسانی حاکم کی پکڑ سے بچ سکتا ہوں، مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں کہ میں اپنے آپ کو خدائی حاکم کی سزا سے بچالوں:

I might escape the human magistrate, but I could note escape punishment at the hands of the Divine Magistrate.

برٹرینڈ رسل نے جان لاک (1632-1704) کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مذہبی عقیدہ کے مطابق خدا نے کچھ خاص اخلاقی قوانین مقرر کیے ہیں ۔ جو لوگ ان قوانین کی پیروی کریں وہ جنت میں جائیں گے اور جو لوگ ان قوانین کو توڑیں وہ اپنے عقیدہ

کے مطابق اپنے لیے یہ خطرہ مول لیتے ہیں کہ انھیں جہنم میں ڈال دیا جائے۔ محتاط قسم کے خوشی کے متلاشی لوگ اس بنا پر نیک اور با اخلاق بن جائیں گے۔ گناہ آدمی کو جہنم میں لے جائے گا، اس عقیدہ میں زوال آنے کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ یہ بات مزید مشکل ہوگئی ہے کہ نیک زندگی اختیار کرنے کے حق میں ایسی دلیل لائی جائے جس کا آدمی خود لحاظ کر سکے۔ بنتھم جو کہ ایک آزاد خیال مفکر تھا، اس نے انسانی قانون ساز کو وہ جگہ دی جو مذہبی عقیدہ کے مطابق خدا کی جگہ تھی۔ اس کے نزدیک یہ قوانین اور سماجی حالات کا کام تھا کہ وہ فرد اور عوام کے مفادات میں ہم آہنگی پیدا کریں، تاکہ ہر شخص اپنی ذاتی خوشی تلاش کرتے ہوئے اجتماعی خوشی کو برقرار رکھنے پر مجبور ہو۔ مگر یہ اس سے کم اطمینان بخش ہے جتنا کہ جنت اور دوزخ کے عقیدہ کے تحت ذاتی مفادات اور عوامی مفادات میں ہم آہنگی کا پیدا ہونا، اس لیے بھی کہ انسانی قانون ساز ہمیشہ دانش مند یا نیک نہیں ہوتا، اور اس لیے بھی کہ انسانی حکومتیں ہمہ بیں اور ہمہ داں نہیں ہیں:

> God has laid down certain moral rules; those who follow them go to heaven, and those who break them risk going to hell. The prudent pleasure-seeker will therefore be virtuous. With the decay of the belief that sin leads to hell, it has become more difficult to make a purely self - regarding argument in favour of a virtuous life. Bentham, who was a free-thinker, substituted the human lawgiver in place of God: it was the business of laws and social institutios to make a harmony between public and private interests, so that each man, in pursuing his own happiness, should be compelled to minister to the general happiness. But this is less satisfactory than the reconciliation of public and private interests effected by means of heaven and hell. both because lawgivers are not always wise and virtuous, and because human governments are not omniscient.
>
> Bertrand Russell. A history of Western Philosophy, pp.592.93

نمونۂ انسانیت

سوامی ویویکانند (1902-1963) نے ایک خط کے جواب میں لکھا تھا کہ میرا تجربہ ہے کہ اگر کبھی کوئی مذہب انسانی برابری کی منزل تک قابل لحاظ حد تک پہنچا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔اس لیے میرا یہ قطعی خیال ہے کہ عملی اسلام کی مدد کے بغیر، ویدانتزم کے نظریات، خواہ ہو کتنے ہی اچھے اور شاندار ہوں، عام انسان کے لیے بالکل بے فائدہ ہیں۔ ہمارے مادر وطن کے لیے دو عظیم نظاموں کا ملاپ، ہندوازم اور اسلام۔ ویدانت دماغ اور اسلام جسم ۔۔۔ واحد امید ہے: میں اپنے ذہن کی آنکھ سے دیکھ رہا ہوں کہ مستقبل کا معیاری ہندستان، انتشار اور افتراق سے نکل کر ویدانت دماغ اور اسلام جسم کے ذریعہ کامیاب اور فتح مند ہو رہا ہے:

> My experience is that if ever any religion approached to this equality in an appreciable manner, it is Islam and Islam alone. Therefore I am firmly persuaded that wighout the help of practical Islam, theories of Vedantism, however fine and wonderful they may be, are entirely valueless to the vast mass of mankind. For our own motherland, a junction of the two great systems, Hindusim and Islam---Vadanta brain and Islam body---is the only hope. I see in my mind's eye the future perfect India rising out of this chaos and strife, glorious and invincible, with Vedanta brain and Islam body.
>
> Letter of Swami Vivekananda (1986), pp-379-80.

مہاتما گاندھی (1869-1947) کانگریسی لیڈروں کو یہ مشورہ دیا کرتے تھے کہ وہ خلیفہ ابوبکر اور خلیفہ عمر کی پیروی کریں:

We have to follow the example of Abu Bakr and Umar.

گاندھی جی نے ایک بار اپنے اخبار (ہریجن) میں لکھا تھا کہ سادگی کانگریسیوں ہی کا اجارہ

نہیں ۔ میں رام چندر اور کرشن کا حوالہ نہیں دیتا۔ کیوں کہ وہ تاریخی شخصیتیں نہ تھیں ۔ میں مجبور ہوں کہ ابوبکر اور عمر کے نام کا حوالہ دوں ۔ اگر چہ وہ بہت بڑی سلطنت کے حاکم تھے۔ مگر انھوں نے فقیروں جیسی زندگی گزاری۔

Simplicity is not the monopoly of Congressites. I am not going to mention the names of Rama and Krishna because they were not historic personalities. I am compelled to mention the names of Abu Bakr and Umar. Though they were masters of vast empire, yet they lived the life of paupers,

Harijan, July 27, 1937.

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی شخصیتوں نے اسلام کی صورت میں جو تاریخ بنائی ہے، وہ ساری انسانیت کے لیے نمونہ کی تاریخ ہے۔ اسلام نے اُن اوصاف کی اعلیٰ ترین مثالیں قائم کی ہیں ۔ جن کو انسانی اوصاف کہا جاتا ہے ۔ فرضی قصے کہانیوں کی صورت میں کوئی بھی شخص ایک کتاب لکھ سکتا ہے۔ مگر انسانیت کے نمونہ کے لیے حقیقی کردار کا حوالہ دینا ہو تو اسلامی شخصیتوں کے سوا کسی اور کا حوالہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس اعتبار سے یہ اسلامی شخصیتیں ساری انسانیت کا مشترک اخلاقی ورثہ ہیں ۔ وہ تمام انسانوں کے لیے بہترین اخلاقی نمونہ ہیں یہاں ہم اس بات کی وضاحت کے لیے مختلف پہلوؤں سے چند تاریخی مثالیں نقل کریں گے۔

اعتماد و توکل

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیدا ہوئے ۔ آپؐ نے اپنی ابتدائی تبلیغ کے تقریباً بارہ سال اسی شہر میں گزارے ۔ اس زمانہ میں مکہ پر مشرکوں کا غلبہ تھا۔ انھوں نے آپؐ کو سخت تکلیفیں پہنچائیں ۔ یہاں تک کہ آپؐ کو مار ڈالنے کے درپے ہوگیے ۔ جب یہ نوبت آ گئی تو آپؐ مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے گیے ۔

اس وقت حالات اتنے سخت تھے کہ مکہ سے نکل کر سیدھے مدینہ جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لیے آپؐ جب مکہ چھوڑ کر نکلے تو ابتداءً تین دن تک غار ثور میں مقیم رہے جو ایک دشوار

گزار پہاڑ کے اوپر ایک تنگ مقام پر واقع تھا۔ تاہم آپؐ کے دشمن آپ کو تلاش کرتے ہوئے وہاں بھی پہنچ گیے۔ آپؐ اپنے رفیق حضرت ابوبکر صدیق کے ساتھ غار میں تھے اور آپؐ کے دشمن تلواریں لیے ہوئے غار سے اتنے قریب کھڑے ہوئے تھے کہ آپؐ اُن کے قدموں کو دیکھ سکتے تھے۔ تمام ظاہری قرائن کے مطابق ہلاکت آپؐ کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق کو یہ صورت حال دیکھ کر سخت تشویش ہوئی۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ وہ تو یہاں بھی آگیے۔ آپؐ نے نہایت سکون کے ساتھ جواب دیا: (اے ابوبکر تمہارا ان دو کے بارے میں کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہو)

یہ فقرہ بلا شبہ توکل و اعتماد کا انتہائی کامل نمونہ ہے۔ اس واقعہ میں انسان توکل کے اس آخری مقام پر نظر آتا ہے جس کے آگے اس اعلیٰ انسانی صفت کا کوئی درجہ نہیں۔

ناخوشگواریوں پر صبر

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ ہے۔ ایک قحط زدہ علاقہ کی مدد کے لیے آپؐ نے ایک یہودی تاجر سے کچھ دینار قرض لیے۔ اس یہودی کا نام زید بن سعنہ تھا۔ زید بن سعنہ سے یہ طے ہوا کہ آپ فلاں مقررہ مدت پر 80 مثقال کھجوریں ادا کریں گے۔

کھجوروں کی ادائیگی کے وقت میں ابھی دو تین دن باقی تھے۔ کہ زید بن سعنہ اچانک آئے۔ اور ترش روئی کے ساتھ اپنے قرض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ اس وقت آپؐ کے کندھے پر ایک چادر پڑی ہوئی تھی۔ زید بن سعنہ نے چادر کو پکڑ کر زور سے کھینچا اور کہا کہ اے محمد میرا قرض کیوں نہیں ادا کرتے خدا کی قسم، میں اولاد مطّلب کو جانتا ہوں۔ وہ سب کے سب نادہند ہیں۔

اس وقت حضرت عمر بن الخطاب آپؐ کے پاس موجود تھے۔ وہ غصہ ہو گیے اور بگڑ کر کہا کہ اے خدا کے دشمن تو یہ کیا کہہ رہا ہے۔ کیا تو اس سے نہیں ڈرتا کہ تیری گردن ماردی جائے۔ مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم ذرا بھی غصہ نہیں ہوئے۔ حتیٰ کہ یہ بھی نہیں کہا کہ تم وقت سے پہلے کیوں قرض کا تقاضا کر رہے ہو۔ اس کے بجائے آپؐ نے حضرت عمر کو تنبیہہ کی اور کہا کہ اے عمر! میں اور یہ ایک اور چیز کے زیادہ محتاج تھے، وہ یہ کہ تم مجھ کو حق کی بہتر ادائیگی کے لیے کہتے اور

اس کوحق کے بہتر مطالبہ کے لیے۔ اس کے بعد آپؐ نے حکم دیا کہ زید بن سعنہ کو مقررہ مقدار میں کھجوریں ادا کر دی جائیں ۔ نیز عمر کی سخت کلامی کے بدلے میں 20 صاع کھجور اور زیادہ دی جائے۔ زید بن سعنہ آپؐ کے اس سلوک کو دیکھ کر اسلام میں داخل ہو گیے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت عرب کے حکمراں تھے۔ وہ زید بن سعنہ کے خلاف کوئی بھی سخت کارروائی کرنے کا پورا اختیار رکھتے تھے۔ اس کے باوجود آپؐ نے زید بن سعنہ کی گستاخی اور بدسلوکی کو یک طرفہ طور پر برداشت کیا۔ آپؐ اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہیں ہوئے۔ یہ ایک انتہائی کامل اور تاریخی مثال ہے جو بتاتی ہے کہ اعلیٰ انسانی سلوک کیا ہے۔ اور کس طرح ایسا ہوسکتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں ایک شخص صبر و برداشت کے اصول پر قائم رہ کر زندگی گزار سکے۔

اعزاز کے بجائے ذمہ داری

ابوبکر بن ابی قحافہ اسلام کے پہلے خلیفہ ہیں۔ ان کا زمانہ خلافت 232ء سے 634ء تک ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد جب ان کو خلیفہ منتخب کیا گیا تو اس کو انھوں نے عہدہ نہیں سمجھا، بلکہ اس کو ایک ذمہ داری سمجھا۔ وہ خوش ہونے کے بجائے فکرمند ہو گیے۔ بیعت کے بعد جب وہ لوگوں کو خطاب کرنے کے لیے ممبر پر کھڑے ہوئے تو احساس ذمہ داری کے تحت ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ انھوں نے کہا:

ایها الناس قد ولیت علیکم ولست بخیر کم فان احسنت فاعینونی وان اسأت فقومونی ۔الصدق امانة والکذب خیانة۔ والضعیف فیکم قوی عندی حتیٰ اٰخذله حقه۔ و القوی ضعیف عندی حتی اخذ منه الحق ان شاء اللہ تعالیٰ۔ (الکامل لابن الاثیر)

اے لوگو، میں تمہارے اوپر حاکم بنایا گیا ہوں، حالاں کہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا کروں تو تم میری مدد کرو اور اگر میں برا کروں تو تم مجھ کو سیدھا کر دو۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے۔ اور تمہارا کمزور میرے نزدیک طاقتور ہے جب تک میں اس کا حق اس کو نہ

دلا دوں۔ اور تمہارا طاقت ور میرے نزدیک کمزور ہے جب تک میں اس سے حق وصول نہ کرلوں، اگر اللہ نے چاہا۔

ابن سعد نے عطاء بن السائب سے نقل کیا ہے کہ جب ابوبکرؓ کی بیعت ہوئی تو اگلے دن لوگوں نے دیکھا کہ وہ حسب معمول اپنے کندھے پر کپڑا رکھے ہوئے بازار جا رہے ہیں۔ عمر فاروق نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بازار جا رہا ہوں۔ عمر فاروق نے کہا کہ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اب آپ مسلمانوں کے حاکم ہیں۔ انھوں نے کہا میں اپنے اہل وعیال کو کہاں سے کھلاؤں گا۔ عمر فاروق نے کہا کہ ابوعبیدہ کے یہاں چلیے۔ وہ آپ کا کفاف مقرر کر دیں گے۔ چنانچہ دونوں ابوعبیدہ کے یہاں گیے۔ انھوں نے ایک عام آدمی کے معیار کے مطابق ابوبکر صدیق کا روزینہ مقرر کر دیا۔ اس میں دو جوڑا کپڑا بھی شامل تھا، ایک جوڑا گرمی کے لیے، اور ایک جوڑا سردی کے موسم کے لیے۔ جب آپ کی وفات کا وقت آیا تو آپ کے گھر میں نہ درہم تھا اور نہ دینار۔ صرف ایک زمین تھی۔ آپ نے وصیت کی کہ یہ زمین بیچ دی جائے اور اس کی قیمت سے وہ سب کچھ بیت المال میں واپس کر دیا جائے جو میں نے خلیفہ کی حیثیت سے لیا ہے۔

حکومتی عہدہ کو اعزاز سمجھنے کے بجائے ذمہ داری سمجھنے کی یہی مثال دوسرے خلفاء نے بھی قائم کی۔ یہ مثال تمام حکمرانوں کو بتاتی ہے کہ وہ کس طرح حکومت کو عزت وشہرت کی چیز نہ سمجھیں، بلکہ ذمہ داریوں کو ادا کرنے کا ایک نازک منصب سمجھیں۔ یہی واحد چیز ہے جو کسی حکومت کو اس کے ماتحت عوام کے لیے خیر اور بھلائی کا ذریعہ بناتی ہے۔

معبود کی یکتائی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات 63 سال کی عمر میں مدینہ میں ہوئی۔ اس وقت لوگوں کے اوپر عجیب دیوانگی کی کیفیت طاری ہوگئی۔ بہت سے لوگوں کو یہ یقین ہی نہ آتا تھا کہ آپؐ کا انتقال ہو سکتا ہے یا انتقال ہو گیا ہے۔ حضرت عمر فاروق اس معاملہ میں سب سے آگے تھے۔ وہ مدینہ کی مسجد نبویؐ میں تلوار لے کر کھڑے ہو گیے اور کہنے لگے کہ جو شخص کہے گا کہ رسول اللہ کی

وفات ہوگئی ہے میں اس تلوار سے اس کی گردن ماردوں گا۔

مسجد نبوی میں زبردست خلفشار جاری تھا۔لوگ سخت مبہوت نظر آرہے تھے۔اتنے میں حضرت ابوبکرصدیق وہاں آئے۔انھوں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اس کے بعد مسجد کے ایک طرف تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوگیے۔اپنی تقریر میں انھوں نے یہ تاریخی جملہ کہا: **من کان یعبد محمدا فان محمداً قد مات و من کان یعبد اللہ فان اللہ حیی لا یموت** (جوشخص محمد کی عبادت کرتا تھا تو محمد کا انتقال ہوگیا اور جوشخص اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ زندہ ہے۔اس پر کبھی موت آنے والی نہیں)اس واقعہ میں انسان معرفت الٰہی کے آخری درجہ پر نظر آتا ہے۔انسان انسان ہے اور خدا خدا ہے۔اس حقیقت کو جاننا ہی اصل علم ہے۔اور یہ واقعہ اس اصل علم کی آخری شاندار مثال ہے

حق کے آگے ڈھ پڑنا

اوپر جو واقعہ نقل کیا گیا اس موقع پر حضرت عمر فاروق کا کردار ابتداءً بے حد انتہا پسندانہ تھا۔انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ پیغمبر اسلام کا جسم بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔مگر انھیں یقین نہیں آیا کہ یہ آپؐ کی وفات کا واقعہ ہے۔انھوں نے سمجھا کہ یہ ایک قسم کی روحانی معراج کا واقعہ ہے آپؐ اپنے رب کے پاس گیے ہیں اور جلد ہی دوبارہ زمین پر واپس آئیں گے۔

وہ اس معاملہ میں کسی کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے حتی کہ حضرت ابوبکرصدیق کی بھی نہیں۔حضرت ابوبکرصدیق نے مسجد نبوی میں داخل ہوکر ان کو چپ ہونے کے لیے کہا۔مگر وہ چپ ہونے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ان کا ہاتھ تلوار کے دستہ پر تھا اور ان کی زبان بے تکان بولے چلی جارہی تھی۔یہ لمحہ تھا جب کہ حضرت ابوبکرصدیق مسجد نبوی میں تقریر کے لیے کھڑے ہوئے۔انھوں نے حضرت عمر فاروق کی آواز پر اپنی آواز کو تیز کرتے ہوئے اپنی تقریر شروع کردی۔یہاں تک کہ حضرت ابوبکرصدیق تقریر کرتے ہوئے اس آیت تک پہنچے: **وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى**

اَعۡقَابِکُمۡ ؕ وَمَنۡ یَّنۡقَلِبۡ عَلٰی عَقِبَیۡہِ فَلَنۡ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیۡـًٔا ؕ وَسَیَجۡزِی اللّٰہُ الشّٰکِرِیۡنَ﴿۱۴۴﴾ (اٰل عمران) (محمد تو صرف ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم الٹے پاوں پھر جاوگے۔ اور جو شخص الٹے پاوں پھر جائے تو وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ شکر کرنے والوں کو ضرور بدلہ دے گا۔

قرآن کی اس آیت کا سننا تھا کہ فوراً حضرت عمر فاروق ٹھنڈے ہو گیے۔ بعد کے زمانہ میں انھوں نے اپنا اس وقت کا حال بتاتے ہوئے کہا: **وقعت علی الارض و ما تحملنی رجلای** (میں زمین پر گر پڑا، میرے پاوں میرا بوجھ نہ سنبھال سکے)

اس واقعہ میں انسان عبدیت کے آخری مقام پر نظر آتا ہے۔ عبدیت یہ ہے کہ انسان خدا کے آگے ڈھ پڑے۔ حضرت عمر فاروق یہی انسان ثابت ہوئے۔ وہ خدا کا کلام سن کر بالکل لفظی طور پر زمین پر گر پڑے۔ اپنی رائے کو انھوں نے اپنے دماغ سے اس طرح نکال دیا جیسے کہ وہ ان کے دماغ میں کبھی تھی ہی نہیں۔ یہ اعتراف حق کی بلند ترین مثال ہے۔ یہ مثال بتاتی ہے کہ حق کے ظاہر ہو جانے کے بعد کس طرح آدمی کو اس کے آگے جھک جانا چاہیے۔

سادہ زندگی

اسلامی خلفاء کے زمانہ میں دولت اور اقتدار دونوں چیزوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا، اس کے باوجود خلفاء بالکل سادہ زندگی گزارتے تھے۔ اس کا اعتراف تمام مورخین نے کیا ہے۔ مانٹگومری واٹ (W.Montgomery Watt) نے لکھا ہے کہ مسلم خلفاء جواب ایک وسیع بادشاہت کے حکمراں تھے، وہ اب بھی مدینہ میں بے حد سادہ طریقہ سے رہتے تھے:

The ruler of what was now a vast empire still lived a very simple life in medina, and had not so much as a bodyguard.

The Majesty That was Islam (1984)

خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصہ کے حکمراں تھے، مگر جسم پر معمولی کپڑا ہوتا تھا، جس میں اکثر پیوند لگا رہتا تھا۔ پانی کی مشک کندھے پر رکھ کر چلتے تھے۔ پتھر کا تکیہ سر کے نیچے رکھ کر زمین پر سو جاتے تھے۔ معمولی کھانا کھاتے اور معمولی گھر میں رہتے۔

ایک بار احنف بن قیس ان سے ملنے کے لیے مدینہ آئے تو دیکھا کہ معمولی حالت میں اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ احنف نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ حضرت عمر نے جواب دیا کہ بیت المال کا ایک اونٹ بھاگ گیا ہے، اس کو تلاش کر رہا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ آپ امیر المومنین ہیں۔ آپ خود کیوں یہ زحمت اٹھا رہے ہیں۔ آپ نے کسی غلام کو حکم دے دیا ہوتا، وہ اس کام کو کر ڈالتا۔ حضرت عمر نے جواب دیا:

(ایُّ عَبدٍ اعبدُ مِنّی) کون ہے جو مجھ سے بڑھ کر غلام ہو۔

سلطنت کا حاکم ہونے کے باوجود اپنے کو عام آدمیوں سے ایک آدمی سمجھنا، اعلیٰ ترین حاکمانہ اخلاق ہے، مگر اس حاکمانہ اخلاق کی عملی مثال اسلامی تاریخ کے سوا کہیں اور نہیں ملے گی۔

حضرت عمر فارق کا زمانہ خلافت 634ء تک ہے۔ انھیں کے زمانہ میں فلسطین فتح ہوا۔ اس فتح کے موقع پر فلسطین کے مسیحی ذمہ داروں کی طلب پر، حضرت عمر نے مدینہ سے فلسطین کا سفر کیا۔ یہ سفر ایک عظیم سلطنت کے عظیم حکمراں کا تھا۔ مگر وہ اتنا سادہ تھا کہ اس کے آگے سادگی کا مزید تصور نہیں کیا جا سکتا۔

عبداللہ التل جو فلسطین کی جنگ (1948) میں شریک تھے۔ انھوں نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے **خطر الیهودیة العالمیة علی الاسلام والمسیحیة**۔ یہ کتاب دار القلم (قاہرہ) سے 1964 میں شائع ہوئی ہے۔ عبداللہ التل کو فلسطین کے ایک معبد میں ایک تاریخی مخطوطہ یونانی زبان میں لکھا ہوا ملا۔ یہ مخطوط جو قدیم زمانہ میں کسی عیسائی نے لکھا تھا، اس میں حضرت عمر کے داخلہ فلسطین کا تذکرہ ہے۔ عبداللہ التل نے اس مخطوطہ کا عربی ترجمہ اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

جب بیت المقدس پر مسلم فوجوں کا حصار بڑھا تو 636ء میں وہاں کا بڑا پادری صفرونیوس شہر کی دیوار پر چڑھا۔ اس نے مسلم فوج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ہم تم سے صلح کرنا چاہتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ صلح تمہارے امیر کے ہاتھ پر ہوگی۔ چنانچہ اس مضمون کا ایک خط مدینہ بھیجا گیا تاکہ امیر المومنین فلسطین آئیں اور اہل فلسطین سے صلح کا معاملہ طے کریں۔

عمر فاروق مدینہ سے بیت المقدس جانے کے لیے نکلے۔ مگر حال یہ تھا کہ ان کے ساتھ صرف ایک سواری اور ایک غلام تھا۔ جب وہ شہر سے باہر آئے تو اپنے غلام سے کہا کہ ہم دو ہیں اور سواری ایک ہے۔ اگر میں سواری پر بیٹھوں اور تم پیدل چلو تو میں تمہارے اوپر ظلم کروں گا۔ اور اگر تم سواری پر بیٹھو اور میں پیدل چلوں تو تم میرے اوپر ظلم کروگے۔ اور اگر ہم دونوں سواری پر بیٹھ جائیں تو ہم اس کی پیٹھ توڑ ڈالیں گے۔ اس لیے ہم لوگ تین باری مقرر کرلیں۔ چنانچہ انھوں نے راستہ اس طرح طے کیا کہ ایک بار عمر سواری پر بیٹھتے اور غلام پیدل چلتا۔ اس کے بعد غلام سواری پر بیٹھتا اور عمر پیدل چلتے۔ اور پھر دونوں پیدل چلتے اور سواری خالی رہتی۔ اس طرح وہ سفر کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ قدس کے قریب پہنچ گیے۔

اتفاق سے اس وقت غلام کی باری تھی۔ غلام نے سواری پر بیٹھ کر چلنے سے انکار کیا اور چاہا کہ آخری مرحلہ میں شہر میں داخلہ اس حال میں ہو کہ سواری پر عمر فارق بیٹھے ہوئے ہوں۔ مگر عمر فاروق اس پر راضی نہیں ہوئے۔ اور وہ قدس کے دروازے پر اس حال میں پہنچے کہ غلام سواری پر تھا اور عمر فاروق پیدل چل رہے تھے، عمر فاروق کو اس حال میں دیکھ کر شہر کے پادریوں نے دروازہ کھول دیا اور عمر کے ہاتھ پر صلح کرلی۔

صلح نامہ کی تکمیل کے بعد حضرت عمر نے ایک مختصر تقریر کی جس میں کہا کہ اے اہل فلسطین جو ہمارے لیے ہے وہ تمہارے لیے ہے اور جو ہمارے لیے نہیں وہ تمہارے لیے بھی نہیں۔ (یا اهل ایلیاء لکم مالنا و علیکم ما علینا) عمر فاروق کا یہ سفر تمام دنیا کے حکمرانوں کے لیے بلاشبہ آخری اور کامل ترین نمونہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

احترام انسانیت

خلیفہ ثانی عُمر فارق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت عَمر و بن العاص مصر کے گورنر تھے۔ انھوں نے ایک بار گھوڑوں کی دوڑ کرائی۔ اس دوڑ میں گورنر کے بیٹے کا گھوڑا بھی شریک تھا۔ مگر جب دوڑ ہوئی تو ایک مصری (غیر مسلم) کا گھوڑا آگے بڑھ گیا۔ مصری نے فتح کے جوش میں کوئی ایسا جملہ کہا جو گورنر کے صاحبزادے (محمد بن عمرو بن العاص) کو برا معلوم ہوا اور انھوں نے مذکورہ مصری کو

کوڑے سے مار دیا۔ مارتے ہوئے ان کی زبان سے نکلا خذھا و انا ابن الا کرمین (یہ لو، اور میں شریفوں کی اولا دہوں)

حضرت انس بن مالک اس قصہ کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مصری (غیر مسلم) مصر سے چل کر مدینہ پہنچا اور خلیفہ ثانی عمر فاروق سے شکایت کی کہ گورنر کے لڑکے نے اس طرح اس کو کوڑے سے مارا ہے۔ حضرت عُمر نے فرمایا کہ تم یہاں ٹھہرو۔ اور فوراًاپنے ایک خاص آدمی کو مصر بھیجا کہ عمرو بن العاص اور ان کے بیٹے محمد بن عمرو جس حال میں ہوں اسی حال میں ان کو لے کر مدینہ آو ۔ چنانچہ وہ لوگ لائے گیے ۔ جب وہ مدینہ پہنچے تو حضرت عمر نے فرمایا: این المصری ، دونك الدرة فاضرب بها ابن الا کرمین (مصری کہاں ہے ۔ یہ کوڑا لو اوراس سے شریف زادہ کو مارو)

اس کے بعد مصری نے کوڑا لیا اور گورنر مصر کے سامنے ان کے صاحبزادہ کو مارنا شروع کیا۔ وہ مارتا رہا، یہاں تک کہ ان کو زخمی کر دیا۔ حضرت عمر درمیان میں کہتے جاتے تھے کہ شریف زادہ کو مارو جب وہ خوب مار چکا تو حضرت عمر فاروق نے کہا کہ ان کے والد عمرو بن العاص کے سر پر بھی مارو، کیوں کہ خدا کی قسم ان کے بیٹے نے صرف اپنے باپ کی بڑائی کے زور پر تم کو مارا تھا۔ (فواللہ ماضربك ابنه الابفضل سلهانه)

مصری نے کہا کہ اے امیر المومنین ،جس نے مجھ کو مارا تھا اس کو میں نے مارلیا۔ اس سے زیادہ کی مجھے حاجت نہیں ۔ حضرت عمر نے کہا: خدا کی قسم اگر تم ان کو بھی مارتے تو ہم تمہارے اوران کے درمیان حائل نہ ہوتے ، یہاں تک کہ تم خود ہی ان کو چھوڑ دو۔ پھر آپ نے عمرو بن العاص سے مخاطب ہو کر فرمایا: یا عمرو ، متی استعبدتم الناس و قد ولدتهم امهاتهم احرار (اے عَمرو،تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا، حالاں کہ ان کی ماوں نے ان کو آزاد پیدا کیا تھا) ابن جوزی، سیرۃ عمر بن الخطاب

یہ واقعہ انسانی احترام اور انسانی برابری کی آخری اعلیٰ مثال ہے ۔ اس واقعہ نے ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان ہر قسم کے فرق کو عملاً ختم کر دیا۔ اس نے انسان عدل

وانصاف کی ایسی نظیر قائم کردی جس کے آگے انسانی عدل وانصاف کا کوئی اور درجہ نہیں۔

بے غرضی

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں قحط پڑا اور لوگ سخت پریشان ہو گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم لوگ نہ گھبراو۔ اللہ جلد ہی تمھارے لئے کشادگی کی صورت پیدا کر دے گا۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ عثمان رضی اللہ عنہ کا تجارتی قافلہ شام سے آیا، اس میں ایک ہزار اونٹ تھے اور سب کے سب گیہوں اور کھانے کی چیزوں سے لدے ہوئے تھے۔ یہ خبر مدینہ میں پھیلی تو شہر کے تاجر عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے۔ انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر آئے۔ ان کے پاس ایک چادر تھی جس کو وہ اپنے کندھے پر اس طرح ڈالے ہوئے تھے کہ اس کا ایک سرا سامنے کی طرف لٹک رہا تھا اور دوسرا پیچھے کی طرف۔

عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا: تم لوگ کیوں آئے ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو۔ تاجروں نے کہا: ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ آپ کے پاس ایک ہزار اونٹ گیہوں اور غذائی سامان آیا ہے۔ ہم ان کو خریدنا چاہتے ہیں۔ آپ ہمارے ہاتھ یہ غذائی سامان بیچ دیں تا کہ ہم اس کو مدینہ کے ضرورت مندوں تک پہنچا سکیں۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا۔ اندر آو اور گھر میں بیٹھ کر بات کرو۔ وہ لوگ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ غذائی اشیاء کے ایک ہزار ڈھیر گھر کے اندر پڑے ہوئے ہیں۔

اب بات چیت شروع ہوئی۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: میری شام کی خریداری پر تم مجھ کو کتنا زیادہ نفع دو گے۔ انھوں نے کہا: دس درہم پر بارہ درہم۔ عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا: مجھ کو اس سے زیادہ قیمت مل رہی ہے۔ انھوں نے کہا: دس درہم پر چودہ درہم۔ حضرت عثمان نے کہا مجھ کو اس سے زیادہ قیمت مل رہی ہے۔ انھوں نے کہا اچھا دس درہم پر پندرہ درہم۔ حضرت عثمان نے کہا کہ مجھ کو اس سے بھی زیادہ مل رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کون آپ کو اس سے زیادہ دے رہا ہے۔ جب کہ مدینہ کے جتنے تاجر ہیں سب یہاں جمع ہیں۔ حضرت عثمان نے کہا کہ مجھ کو

ہر ایک درہم کے بدلے دس درہم مل رہا ہے۔ پھر کیا تم اس سے زیادہ دے سکتے ہو۔ انھوں نے کہا نہیں۔ حضرت عثمان نے فرمایا کہ اللہ نے اپنی کتاب پاک میں فرمایا ہے کہ جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لیے اس کا دس گنا بدلہ ہے (انعام 160) تو اے مدینہ کے تاجرو، گواہ رہو کہ میں نے یہ تمام غذائی سامان اللہ کے لیے شہر کے ضرورت مندوں پر صدقہ کر دیا (العبقریات الاسلامیہ، صفحہ 572)

یہ واقعہ خدا کے وعدہ پر یقین کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ خدا پر ایمان آدمی کے اندر اسی قسم کا یقین اعتماد پیدا کرتا ہے۔ اور جس آدمی کے اندر اس قسم کا یقین و اعتماد پیدا ہو جائے وہ اغراض و مصالح سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ اس کے حوصلے اتنا زیادہ بلند ہو جاتے ہیں کہ اس کے بعد بڑی سے بڑی قربانی بھی اس کے لیے مشکل چیز نہیں رہتی۔

عوام اور حاکم کے درمیان قانونی برابری

حضرت علی بن ابی طالب اسلام کے چوتھے خلیفہ تھے۔ انھیں غیر معمولی اقتدار حاصل تھا، مگر وہ لوگوں کے درمیان ایک عام انسان کی طرح رہتے تھے۔ نہ ان کا معیار زندگی دوسروں سے مختلف تھا اور نہ ان کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ قانونی حقوق حاصل تھے۔

ترمذی، حاکم اور ابونعیم نے حضرت علی بن ابی طالب کا ایک واقعہ اس طرح نقل کیا ہے۔ حضرت علی کے پاس ایک زرہ تھی جو اتفاق سے کھوئی گئی۔ ایک روز کوفہ کے بازار کی طرف گیے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک نصرانی زرہ بیچ رہا ہے۔ قریب جا کر دیکھا تو یہ وہی زرہ تھی جو ان سے کھوئی گئی تھی۔

حضرت علی اس وقت ممالک اسلامی کے حکمراں تھے۔ وہ چاہتے تو اسی وقت زرہ پر قبضہ کر سکتے تھے۔ مگر انھوں نے اپنے آپ کو قانون سے بالاتر نہ سمجھا۔ انھوں نے نصرانی سے کہا کہ یہ زرہ میری ہے۔ تم اس کو لے کر قاضی کے پاس چلو۔ وہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا۔ اس وقت مسلمانوں کے قاضی شُریح تھے۔ چنانچہ دونوں بازار سے چل کر قاضی شُریح کے یہاں پہنچے۔ شریح نے بحیثیت قاضی کے پوچھا کہ امیر المومنین، آپ کیا کہتے ہیں۔ حضرت علی نے کہا

کہ یہ زرہ میری ہے، وہ مجھے واپس دلائی جائے۔ شُریح نے نصرانی سے پوچھا کہ تم کیا کہتے ہو۔ اس نے کہا کہ امیر المومنین غلط بیانی کر رہے ہیں، یہ زرہ میری ہے۔ قاضی شُریح نے حضرت علی سے کہا کہ محض آپ کے دعوے کی بنا پر میں ایسا نہیں کرسکتا کہ زرہ اس سے لے کر آپ کو دیدوں۔ آپ اپنے دعوے کے حق میں ثبوت لائیے۔

حضرت علی نے کہا کہ شُریح کا مطالبہ درست ہے۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے حق میں دو گواہ پیش کیے۔ ایک، اپنے غلام قنبر کو، اور دوسرے، اپنے لڑکے حسن کو۔ قاضی شریح نے کہا کہ میں قنبر کی گواہی کو تو مان رہا ہوں، مگر میں حسن کی گواہی کو نہیں مانتا۔ حضرت علی نے کہا کہ تم حسن کی گواہی نہیں مانتے، حالاں کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حسن اور حسین نوجوانانِ جنت کے سردار ہیں۔ قاضی شُریح نے کہا کہ وہ الگ چیز ہے۔ دنیوی معاملات میں اسلام کا اصول یہ ہے کہ والد کے حق میں اولاد کی گواہی معتبر نہیں۔

حضرت علی خلیفہ تھے اور وہ قاضی کو معزول کرنے کا اختیار رکھتے تھے۔ مگر انھوں نے قاضی کے فیصلہ کے آگے سر جھکا دیا۔ اور زرہ کے بارہ میں اپنا مطالبہ واپس لے لیا۔ نصرانی یہ دکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ چیخ اٹھا اور کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ پیغمبروں کے احکام ہیں کہ امیر المومنین ایک عام آدمی کی طرح قاضی کی عدالت میں آئے اور قاضی اس کے خلاف فیصلہ کرے۔ میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ پھر اس نے کہا کہ یہ زرہ واقعۃً علی کی ہے۔ ایک بار وہ علی کے اونٹ سے گر گئی تھی تو میں نے اس کو اٹھا لیا۔ اب حضرت علی نے وہ زرہ اسی شخص کو دے دی اور اس کو مزید سات سو درہم عطا کیے۔ اس کے بعد وہ مسلمان ہو کر حضرت علی کے ساتھ رہا یہاں تک کہ صفین کے معرکہ میں شہید ہو گیا

(حیات الصحابہ، الجزء الاول، صفحہ 34-235)

یہ واقعہ اس اصول کی اعلیٰ ترین مثال ہے کہ حکمران افراد اور عام انسان دونوں قانون کی نگاہ میں برابر ہیں۔ قانون کی عدالت میں دونوں کو یکساں حاضر ہونا چاہیے اور دونوں کے اوپر قانون کا فیصلہ یکساں طور پر نافذ ہونا چاہیے۔

حقیقت پسندی

حضرت حسن حضرت علی کی شہادت کے بعد خلیفہ مقرر ہوئے۔ وہ اسلامی تاریخ کے پانچویں خلیفہ تھے۔ انھیں تمام شرعی اور اخلاقی اصولوں کے مطابق خلافت پر قائم رہنے کا حق حاصل تھا۔ مگر جب انھیں خلافت ملی تو صورت حال یہ تھی کہ حضرت امیر معاویہ جو اس وقت شام کے حاکم تھے، انھوں نے خلافت سے باقاعدہ بغاوت کر دی۔ خونِ عثمان کا بدلہ لینے کے نام پر انھوں نے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنے ساتھ کر لیا۔

حضرت حسن بن علی نے حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ چالیس ہزار کی فوج ان کے ساتھ ہے اسی طرح حضرت امیر معاویہ کے ساتھ بھی تقریباً اتنے ہی آدمی تھے۔ یہ دونوں فوجیں جوش و جذبہ سے بھری ہوئی تھیں اور ایک دوسرے کے خلاف لڑنے کے لیے بے قرار تھیں۔ مگر حضرت حسن نے سوچا کہ یہ دونوں کے دونوں مسلمان ہیں۔ جنگ کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان آپس میں لڑیں۔ وہ قیمتی افراد جو اسلام کے جھنڈے کے نیچے اس لیے جمع ہوئے تھے کہ وہ دنیا سے شرک کا خاتمہ کریں وہ خود اپنے آپ کو اور اسی کے ساتھ اسلامی تاریخ کو ختم کر ڈالیں گے۔

حضرت حسن کی حیثیت جائز خلیفہ اسلام کی تھی۔ جب کہ امیر معاویہ کی حیثیت یقینی طور پر باغی کی تھی مگر حضرت حسن نے بجا طور پر یہ اندازہ لگایا کہ حضرت امیر معاویہ کسی قیمت پر جھکنے کے لیے تیار نہ ہوں گے۔ وہ ہر حال میں لڑائی کو جاری رکھیں گے خواہ اس کا نتیجہ مسلم سپاہیوں کی عام بربادی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ حضرت حسن نے خود اپنے آپ کو جھکانے پر راضی کر لیا۔ مسلمانوں کو باہمی قتل و خون سے بچانے کے لیے انھوں نے یک طرفہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ وہ امیر معاویہ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو جائیں۔

یہ حقیقت پسندی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ یہاں انسان حقیقت پسندی کی اعلیٰ ترین سطح پر نظر آتا ہے، وہ سطح جہاں انسان اپنے آپ کو حذف کر کے سوچ سکتا ہے۔ حضرت حسن نے اپنے آپ کو حذف کر کے سوچا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو راضی کر سکے جس کی کوئی دوسری مثال تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔

عدل وانصاف

حضرت عمر بن عبدالعزیز (۱۰۱۔۶۲ھ) پانچویں خلیفہ راشد ہیں۔آپ کے خادم ابوامیہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز آپ کی اہلیہ سے کہا کہ مسور کی دال کھاتے کھاتے میرا برا حال ہو گیا ہے۔خاتون نے جواب دیا: تمھارے خلیفہ کا بھی روز کا کھانا یہی ہے۔آپ سے پہلے خلیفہ کی حفاظت کے لیے ایک سو سپاہی مقرر تھے، جب آپ خلیفہ ہوئے تو آپ نے سب کو دوسرے سرکاری کاموں میں لگا دیا اور فرمایا: میری حفاظت کے لیے قضاوقدر ہی کافی ہے۔یہ اس شخص کا حال تھا جس کی سلطنت کے حدود سندھ سے لے کر فرانس تک پھیلے ہوئے تھے۔

آپ کی خلافت کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ سمرقند کے باشندوں کا ایک وفد آیا۔اس نے ایک فوجی سردار قتیبہ بن مسلم باہلی کے بارے میں یہ شکایت کی کہ اسلامی قاعدہ کے مطابق انھوں نے ہم کو پیشگی تنبیہ نہیں کی اور ہمارے شہر میں اچانک اپنی فوجیں داخل کر دیں۔لہٰذا ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے۔سمرقند کی فتح حضرت عمر بن عبدالعزیز سے پہلے ہوئی تھی۔اور اب اس پر سات سال گزر چکے تھے۔مگر آپ نے انصاف کے تقاضے کو پورا کرنا ضروری سمجھا۔حضرت عمر بن عبدالعزیز نے عراق کے حاکم کو لکھا کہ سمرقند کے لوگوں کے مقدمہ کی سماعت کے لیے ایک خصوصی قاضی مقرر کریں۔عراق کے حاکم نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور جمیع بن حاضر الباہلی کو اس کا قاضی مقرر کیا۔ان کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔دونوں فریق نے آزادانہ طور پر اپنے اپنے دلائل پیش کئے۔آخر میں قاضی نے سمرقند والوں کی شکایت کو درست قرار دیتے ہوئے فیصلہ سنایا کہ۔۔۔مسلمانوں کی فوج سمرقند کو چھوڑ کر باہر آجائے اور اہلِ سمرقند کو ان کا قلعہ اور تمام دوسری چیزیں واپس کر دی جائیں۔اس کے بعد اسلامی قاعدہ کے مطابق مسلمانوں کا فوجی سرداران کے سامنے ضروری شرطیں پیش کرے۔اگر وہ تمام شرطوں کو ماننے سے انکار کر دیں تو پھر اس کے بعد ان سے جنگ کی جائے۔

اسلامی فوج اس وقت فاتحانہ حیثیت رکھتی تھی۔اس نے چین جیسے ملک کے بادشاہوں کو بھی ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔مگر جب قاضی نے اپنا فیصلہ سنایا تو اسلامی فوج کے

سردار نے کسی بحث کے بغیر اس کو مان لیا۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ پوری فوج سمرقند چھوڑ کر نکل آئے۔ تاہم اس پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آئی۔ سمرقند کے لوگوں نے جب دیکھا کہ مسلمان اس قدر با اصول اور انصاف پسند ہیں تو وہ حیران رہ گئے۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی ایسے بے لاگ انصاف کا تجربہ نہیں کیا تھا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ مسلم فوج کا آنا ان کے لیے رحمت کا آنا ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی مرضی اور خوشی سے مسلم حکومت کو قبول کرلیا۔ وہ کہہ اٹھے: خوش آمدید، ہم آپ کے مطیع وفرماں بردار ہیں۔ (مرحبا سمعنا واطعنا، فتوح البلدان للبلاذری)

یہ واقعہ عدل وانصاف کا جو نمونہ پیش کررہا ہے۔ اس کی مثال ساری تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ اس واقعہ میں عدل وانصاف کا اصول اپنے آخری اعلیٰ مقام پر نظر آتا ہے۔ عدل بلاشبہ انسانی زندگی کی بلندترین قدر ہے، اور یہ واقعہ اس قدر کے اعتراف کی بلندترین عملی مثال۔

تعمیر کی طرف

ملک کی تعمیر دراصل قوم کی تعمیر کا دوسرا نام ہے، اور قوم کی تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ افراد کو تیار کیا جائے۔ افراد کی تعمیر سے قوم بنتی ہے، اور قوم کے بننے سے ترقی یافتہ ملک وجود میں آتا ہے۔ کسی ملک کی تعمیر کا کام جلسوں اور تقریروں کے ذریعے نہیں ہوسکتا۔ ملک کی تعمیر کے لئے ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے کہ منصوبہ بند انداز میں اس کے لئے سنجیدہ کوشش کی جائے۔